ساز بیخودی نظموں، اور رباعیات پر مشتمل ہے، نظمیں انصاری صاحب کی فکر کی جولان گاہ اور دردمند و اثر پذیر دل کی صدائے بازگشت ہیں، یہ مختلف واقعات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں، ان میں اس عہد اور ماحول کی مرقع کشی کی گئی ہے، ان سے شاعر کے جوش طبع، قوت تخیل، شدت احساس اور دقت نظر و مشاہدہ کے علاوہ اس کی دردمندی، انسان دوستی اور حب الوطنی کا بھی پتہ چلتا ہے، دہر آشوب، بے رحم مہاجن سے خطاب، ہندوستانی کسان، نیچ ذات، گنگا کی بھینٹ اور فریاد میں موجودہ دور کی وحشت و بربریت اور سماجی و معاشی ناہمواری کا دلدوز منظر بیان کیا گیا ہے، جنت کشمیر، دھانی کھیت کی ایک شام، گومتی، روح کا خطاب، اصرار پیہم، عید ملن، یاد ایام، پپیہا اور شاعر اور نالۂ جرس وغیرہ بھی بڑی موثر اور کامیاب نظمیں ہیں، اور ان سے محاکات اور منظر نگاری میں مصنف کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں رباعیات کا حصہ ہے جنکو مصنف نے اپنی ذہنی آوارگی کا نتیجہ کہا ہے، اور جن کے بارہ میں انکا یہ بجا خیال ہے کہ "میں نے اس صنف سخن کو حکیمانہ بنانے سے زیادہ شاعرانہ بنانے کی سعی بلیغ کی ہے"، ہر صنف کلام سے شاعر کی زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت فکر و خیال کی لطافت و بلندی، اسلوب و طرز ادا کی جدت و تازگی تشبیہات و استعارات کی دلکشی و رعنائی اور کلام کے اثر و دلکشی کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ اس پر کیف کلام سے ارباب ذوق لطف اندوز ہوں گے۔

سب کے نبی۔ مرتبہ۔ مولانا عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری، تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۵۹ قیمت ۳؍ پتہ۔ علمی کتاب گھر، شاہ گنج، جونپور۔

مولانا عثمان احمد صاحب نے بچوں کے لیے سیرت طیبہ پر یہ مختصر کتاب سادہ اور آسان زبان میں لکھی ہے، بچوں کیلئے سیرت پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اس نئی کتاب کا طرز بیان دلچسپ ہے اور جا بجا مناسب اشعار سے بھی مزین ہے، اس لیے امید ہے کہ بچے اسکو شوق سے پڑھیں گے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت سے سبق حاصل کریں گے۔

"ض"

جلد ۱۱۹ ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ عدد ۴

مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۲۴۲-۲۴۴
مقالات		
افغانستان میں آٹھ روز	جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ	۲۴۵-۲۶۶
صبح الاعشیٰ	محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے علیگ (رفیق دارالمصنفین)	۲۶۷-۲۸۶
تحفۃ الحبیب تالیف فخری بن امیری ہروی	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۸۷-۳۰۰
متنبی کی شخصیت اور شاعری	جناب مولوی شفیق احمد خاں ندوی لکچرر عربی اجمل خاں طبیہ کالج؛ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)	۳۰۱-۳۱۲
ادبیات		
دارالمصنفین	جناب محمود الرحمن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن	۳۱۳-۳۱۴
ترجمہ غزل خسرو	از ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب	۳۱۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۱۵-۳۲۰

شذرات

خاکسار ایک طویل عرصہ کی غیر حاضری کے بعد دارالمصنفین کے علمی گلکدہ اور اپنی روح کے عشرتکدہ میں واپس آیا ہے، گذشتہ مارچ میں حکومت ہند کی اجازت سے سیرت کی بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کے لئے پاکستان گیا جس کی روداد مئی ۷۶ء کے معارف میں چھپ چکی ہے۔

اس سفر میں حکومت پاکستان کی توجہ ایک بار پھر وہاں کے بعض ناشروں کی زیادتی کی طرف دلائی جو دارالمصنفین کی مطبوعات کو غیر قانونی طور پر چھاپ کر اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا رہے تھے، معارف میں پہلے ذکر آیا ہے کہ اس کے خلاف ایک اخباری مہم جناب سید حسام الدین راشدی نے چلائی تھی، جن کو اپنی علمی تحقیق وکاوش کی وجہ سے پاکستان میں اونچا مقام حاصل ہے، انھوں نے دارالمصنفین کی فریاد پاکستان کے وزیر امور مذہبی مولانا کوثر نیازی تک پہنچائی، جو بڑے لائق، اور فاضل اہل علم ہونے کے ساتھ، بڑے علم نواز اور علم دوست بھی ہیں، انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اس مسئلہ کی طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی توجہ دلائی، جنھوں نے اپنی معارف شناسی اور ہندوستان سے خیرسگالی کی خاطر اس سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا،

مولانا کوثر نیازی نے پاکستان کے وزیر تعلیم جناب عبد الحفیظ پیرزادہ پر بھی اس معاملہ کی نوعیت کو اچھی طرح واضح کیا جنھوں نے اپنی فراخدلی سے پاکستانی ناشروں کی بدعنوانی پر اظہار افسوس کر کے اپنی علم پروری کا ثبوت دیا، مولانا ظفر احمد انصاری پاکستان کی قومی اسمبلی کے آزاد ممبر ہیں، وہ ایوان کے بڑے باوقار، با احترام اور قابل اعتبار رکن سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے بھی جناب پیرزادہ صاحب سے کئی بار مل کر اس معاملہ کو طے کرانے کی کوشش

فرمائی، بالآخر جناب پیرزادہ صاحب نے کمال عنایت سے اپنی وزارت کو تفصیلات پر غور کرنے کی ہدایت فرمائی۔

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ نے خاکسار کو اس کی مطبوعات کا حق طباعت وہاں کے کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ کو دے کر اس کے بدلے میں خاطر خواہ رائلٹی حاصل کرنے کا اختیار دیا تھا، اس کے لئے درخواست مرتب کرتے وقت جناب قدرت اللہ شہاب آئی سی ایس نے مفید قانونی مشورے دیئے، وہ اس وقت محکمہ تعلیم میں ثقافتی امور کے سکریٹری تھے، اب ریٹائر ہو گئے ہیں، بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں، بڑے مذہبی بھی ہیں، اردو کے مشہور شاعر جناب فیض احمد فیض کو بھی اس درخواست سے دلچسپی ہوئی، وہ اس وقت وزارت تعلیم میں تعلیمی مشیر ہیں، جب یہ درخواست وزارت تعلیم میں پہنچی تو اسکے ایڈیشنل سکریٹری ڈاکٹر محمد اجمل نے اس کی طرف پوری توجہ کی، وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، ان کا خاص علمی موضوع نفسیات ہے معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات اور مواعظ کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں مشغول ہیں، جناب قدرت اللہ شہاب کی جگہ پر محکمہ تعلیم کے ثقافتی امور کے سکریٹری جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہوئے تو انھوں نے اپنی غیر معمولی شرافت اخلاق، دل نوازی عجز و انکسار اور علم نوازی سے اس معاملہ میں ہر طرح کی مخلصانہ کوشش کی، وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہیں، اپنی علمی بصیرت اور قابلیت کی وجہ سے پاکستان میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں،

دفتری کارروائی کے سلسلے میں سب سے پہلے جناب زاہد ملک جوائنٹ سکریٹری وزارت امور مذہبی نے بڑی خوش اخلاقی اور محنت سے اس معاملہ کو آگے بڑھایا، کپتان السانی جوائنٹ سکریٹری وزارت تعلیم، جناب محمد زعیم الرحمٰن اڈیشنل سکریٹری محکمہ خزانہ اور ان ہی کے محکمہ کے

جوائنٹ سکریٹری جناب امین اللہ نے بڑے لطف وکرم سے نوازا، وزارت تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری حسن شوکت صاحب نے دفتری کارروائی کو جلد از جلد انجام دینے میں پوری مدد کی، شاہ محی الحق صاحب (سیکشن آفیسر محکمۂ قانون) نے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں، نسیم احمد صاحب (سیکشن افیسر محکمۂ خزانہ) کی وجہ سے دفتری کارروائی میں آسانی ہوئی،

یہ معاملہ آخر میں نیشنل بک فونڈیشن کے حوالہ کیا گیا، جو وزارت تعلیم کے ماتحت نشر و اشاعت کا ایک اہم ادارہ ہے، اس کی شہرت بیرونی ممالک میں بھی پہنچ رہی ہے، اس کے انتظامی بورڈ کے ڈائرکٹر جناب یونس سعید ہیں، جو انگریزی زبان میں اپنی قابلیت کی وجہ سے پاکستان کے علمی حلقہ میں مقبول ہیں، وہ دار المصنفین کی مطبوعات میں سیرۃ النبیؐ سے کچھ ایسے متاثر تھے کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کے خواہاں ہوئے، مگر جب میں نے اُن سے پہلے خطبات مدراس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اس کے لئے ایسے مستعد ہوئے کہ دن رات کی عرق ریزی کے بعد میرے قیام پاکستان ہی کے زمانہ میں اس کا پورا ترجمہ ختم کر ڈالا، اور خوش تھے کہ ایک اہم اور لائق ثواب کام انجام پاگیا۔ اُن کے ساتھ اُن کے ڈپٹی ڈائرکٹروں میں سے جناب محمد شمیم رضوی، ڈاکٹر اے۔ آر۔ ملک، جناب اکرام قمر اور منظور احمد صاحبان نے نیشنل بک فونڈیشن اور دار المصنفین کے درمیان معاہدہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں ہر قسم کا تعاون کیا۔ جس کی شرط یہ قرار پائی کہ نیشنل بک فونڈیشن پندرہ ۱۵ لاکھ پاکستانی روپیے دے کر دار المصنفین کی ۱۱۵ کتابوں کا حق طباعت خرید لے، جو صرف پاکستان کے لئے محدود ہو،

اس معاہدہ پر دستخط کرتے وقت پاکستان کے اہم روزانہ اخبارات، ریڈیو، اور ٹیلی ویزن کے نمایندے موجود تھے، اُن کو مخاطب کرنے کا بھی موقع ملا۔ پاکستان کے ارباب حکومت نے ازراہ کرم وانصاف دار المصنفین کو اپنے یہاں کے بعض ناشروں کی بیجا حرکتوں سے جس طرح بچالیا اس کا دلی شکریہ اس موقع پر ادا کیا۔ جب اس معاملہ کی کارروائی شروع کی گئی تھی، تو ہمارا ہندوستانی سفارت خانہ باضابطہ طور پر پاکستان میں قائم نہ تھا لیکن کراچی میں معاہدہ پر دستخط ہوا تو اس کی عکسی نقل اپنے سفارتخانہ کو اسلام آباد بھیج دی،

دار المصنفین کے بانی علامہ **شبلی نعمانی** رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا غیر معمولی اثر پاکستان میں اب بھی موجود ہے، اس ادارہ کے معمار استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ وہاں کی سرزمین میں ابدی نیند سو رہے ہیں، دونوں بزرگوں کی روحوں نے فضا کو ہموار کیا، وہاں کے تمام اخبارات خصوصاً ڈان، حریت، نوائے وقت، جنگ، اخبار جہاں اور چٹان نے یہ صدا بلند کر رکھی تھی، کہ شبلی و سلیمان کے ادارہ کو نقصانات نہ پہونچنے پائیں، وہاں کے ناشروں کی بدعنوانیوں کو ڈان کراچی نے طباعتی قزاقی، اور چٹان لاہور نے چوری اور سینہ زوری قرار دیا،

اسلام آباد کے قیام میں جناب شریف الحسن ڈائرکٹر جنرل پاکستان سنٹر کے حسن سلوک سے متاثر رہا، عربی، اردو اور دوسری زبانوں کے اشعار جو اُن کی نوک زبان پر ہیں، اس سے اُن کی قوت حافظہ کا معترف ہوا، جناب افتخار احمد شروانی ڈائرکٹر جنرل نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کی کرمفرمائیوں سے بہت سی مشکلیں آسان ہوئیں، ڈاکٹر علی اکبر جعفری ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

ایرانی ہیں لیکن اپنوں کی طرح ملنے میں سبقت کی، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر رشید جالندھری نے ہر طرح کی قدردانی کی، پروفیسر قدرت اللہ فاطمی (ڈائرکٹر آر۔سی۔ڈی) نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ جو خاطر و مدارات کی، اس سے سفر میں حضر کا مزہ ملتا رہا۔ اسکی خوشگوار یادیں ہمیشہ باقی رہیں گی، اُن کے ڈپٹی ڈائرکٹر جناب امین احمد نے بھی پوری خاطرداری کی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی (لائبریرین اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ) کی پُرکیف اور پراز معلومات علمی صحبتوں کی وجہ سے طویل قیام کی گرانی محسوس نہیں ہوئی، اس ادارہ کے افسران اسپشل ڈیوٹی جناب احمد بشیر کو ہر موقع پر خلیق اور ملنسار پایا، یہاں کے فیلو حافظ محمود غازی اور اُن کے چھوٹے بھائی حافظ محمد غزالی کی سعادت مندی اور تواضع راحتِ جان بنی رہی، ہندوستان کے مشہور عالم مولانا محمد سورتی مرحوم کے لائق فرزند اور ندوۃ العلماء کے مشہور استاذ جناب خلیل عرب کے داماد مولانا عبدالرحمٰن سورتی اپنے مذہبی خیالات کا برملا اظہار کرکے محفوظ کرتے رہے، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی (سابق اڈیٹر فکر و نظر) احمد خاں صاحب (ڈپٹی لائبریرین اور اب لائبریرین اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ) محمد فاضل شمسی صاحب (فیلو اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ) اور جناب علی جونپوری (نمائندہ خبر سان الخبی سعودی عرب) نے پذیرائی میں برابر پیش قدمی کی، محمد طیب صاحب (مونوپولی کنٹرول) نے خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، پانچ مہینے کی میزبانی عزیزی مصباح الہدیٰ انفارمیشن آفیسر حکومت پاکستان نے کی۔ اور کسی لمحہ کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا،

واپسی پر مذکورۂ بالا معاہدہ کی تفصیلات کی اطلاع اپنی مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ساتھ ضلع کے حکام کو بھی دی،

مقالات

افغانستان میں آٹھ روز

از جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ

(۲)

مسجد جامع ہرات کی زیارت کے بعد ہم لوگ پھر ہوٹل موفق کو واپس آگئے اور یہاں نصف ساعت آرام کرنے کے بعد گازرگاہ کو روانہ ہوئے، جہاں خواجہ انصاری کا مزار ہے، قصبہ گازرگاہ ہرات سے تین کیلومیٹر دور شمال کی جانب کوہستانی علاقے میں واقع ہے، وہاں پہنچنے پر درگاہ کے متولی جناب میر محمد افضل اور گورنر جناب غلام علی آئین اور دوسرے علما و فضلا نے ہمارا استقبال کیا، اور ہمیں ایک عمدہ عمارت کے اندر لے گیے جس کے صحن میں متعدد قبریں ہیں، خواجہ انصاری کی قبر ایک چوبی ضریح کے اندر صحن سے کچھ بلند مقام پر بنی ہوئی ہے، قبر کی لمبائی تین میٹر کے قریب ہے، اس پر مخمل کی چادر چڑھی ہوئی ہے، مرقد خواجہ سے ملحق سلطان غیاث الدین غوری نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا جو چنگیز خاں کے حملوں کے دوران میں ویران ہو گیا بعد میں شاہرخ مرزا کے حکم سے اسی مقام پر ایک عالیشان و نفیس عمارت بنائی گئی، جس کو کاشی کاری سے مزین کیا گیا ہے، یہ عمارت

ہنوز موجود ہے، اور اس میں لوح مزار و دیگر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ خواجہ انصاری کے مرقد کے پاس نیچے صحن میں ان کے دو بیٹوں شیخ اسماعیل اور عبدالہادی کی قبریں ہیں، عبدالہادی باطنیوں کے ہاتھوں سے ہرات میں شہید ہوئے تھے، ان کی لاش ان کے گھر میں دفن کر دی گئی تھی، بعد میں ان کے ارادتمندات وہاں سے اکھاڑ کر گازرگاہ لے آئے اور یہاں دفن کر دیا، مقبرۂ خواجہ کے نیچے سیاہ و سفید سنگ مرمر پر قرن نہم ہجری کے مشہور خطاط سلطان علی کے قلم سے لکھے ہوئے کتبے ہیں، اس صحن میں خاندان تیمور کے شاہزادوں کی چار قبریں ہیں، سلطان حسین مرزا کے بیٹے غریب مرزا کی قبر پر ایک ہفت قلمی کتبہ ہے جو سات سال میں تیار ہوا تھا، اور جو حکاکی و کندہ کاری کے لحاظ سے مشرقی اور اسلامی ہنر کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے،

مزارات کے باہر ایک پُرفضا باغ ہے، جسے امیر علی شیر نوائی نے اس زمانے میں لگوایا تھا جب وہ گازرگاہ میں عزلت نشیں اور اس درگاہ کا متولی تھا، اس باغ میں دو عمارتیں بھی نمکدان کی شکل کی نوائی تھیں جن میں سے ایک سیلاب میں خراب ہو گئی ہے، دوسری موجود ہے، اسی عمارت میں ہم لوگوں کے لیے شام کی چائے کا اہتمام کیا گیا تھا، جمی ہوئی بالائی یہاں کی خاص چیز ہے، اس کے علاوہ کشمش، بادام، پنیر، روٹی کے ٹکڑے میزوں پر سجا دیے گئے تھے، ایک قسم کی مٹھائی بھی تھی، جو کھوے سے بنی ہوئی تھی اور جو نقل کی شکل کی ہوتی ہے اور جسے یہاں نقل ہی کہتے ہیں۔

گازرگاہ کی زیارت کر کے ہم لوگ ہوٹل کو واپس ہوئے، راستے میں خواجہ عبداللہ انصاری کے استاد و سرپرست ابو اسمٰعیل احمد بن حمزہ صوفی معروف بہ شیخ عمو کی قبر کی بھی زیارت ہوئی جو مزار خواجہ کے شمال میں کوہ زنجیرگاہ کے دامن میں ایک پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ وہاں سے ہم لوگ مغرب کے قبل ہوٹل کو لوٹ آئے اور مغرب کے بعد ہم لوگوں کا

قافلہ پھر گازرگاہ کی طرف روانہ ہوا، کیونکہ وہاں متولی کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت تھی، اور اس کے بعد ایک محفل عرفانی کے انعقاد کا پروگرام تھا، گازرگاہ کے راستے میں جا بجا روشنی کی گئی تھی، اور پولیس کے سپاہی تعینات تھے، درگاہ پہنچ کر ہم نے بجلی کی روشنیوں میں مرقد خواجہ پر پھر فاتحہ پڑھا، اس کے بعد نمکدان کی بالائی منزل پر کھانے کو گئے، جہاں ہندمشرقی قاعدے سے فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا ...... اور اس پر کھانے کی تقریباً حسب معمول چیزیں رکھی ہوئی تھیں، البتہ یہاں دو چیزیں نئی تھیں ایک تو شولا، اور دوسرے دہی، دونوں ہرات کی مشہور غذا شمار ہوتی ہیں، مجھے اشتہا نہ تھی، صرف تھوڑا سا شولا چکھا پسند نہ آیا، البتہ دہی بہت خوب تھا اور اسے میں نے کسی قدر زیادہ کھایا۔

ساڑھے نو بجے رات کو کھانا ختم ہوا تو ہم لوگ ایک خانقاہ میں جمع ہوئے جو مزار خواجہ کے جنوب مشرق میں اسی سے ملحق ہے، خاصی بڑی عمارت ہے۔ اس کی چھت گنبد اور دیواروں پر طلائے محلول اور لاجورد سے نقش و نگار بنے ہیں اور محرابوں پر کلام اللہ کی آیتیں خوبصورت حروف میں تحریر ہیں، اسے عہد شاہرخ کی سقف سازی کا نادر نمونہ تصور کیا جاتا ہے، مشہور ہے کہ جب اینٹ جمانے اور پلاسٹر لگانے کا کام مکمل ہو گیا تھا، تو ایک رومی نقاش شاہرخ کے دربار میں آیا تھا، اور اس نے ہرات کے نقاشوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا، میں نے سمجھا تھا کہ یہاں مجلس سماع منعقد ہوگی، لیکن اس محفل میں خواجہ انصار کے احوال زندگانی اور مقام عرفانی کے متعلق مختلف علما کی تقریریں ہوئیں، نظمیں پڑھی گئیں اور الٰہی نامہ اور مناجات کے جملے پڑھ کر سنائے گئے، ۱۱ بجے کے بعد یہ محفل ختم ہوئی اور ہم یہاں سے رخصت ہو کر پھر نمکدان میں جمع ہوئے، جہاں متولی درگاہ کی طرف سے

مسٹر آئین نے تمام مہمانوں کو کاغذ میں لپٹا ہوا ایک ایک پیکٹ تبرک کے طور پر مرحمت
کیا، میں نے اسے بعد میں کھول کر دیکھا تو اس میں دو ریشمی رومال ملے ایک اچھا بڑا جس پر
بیادگار ہزارویں سال ولادت خواجہ عبداللہ انصاری بناوٹ کے اندر منقوش ہے اور
دوسرا چھوٹا سادہ سفید ہے، یہ دونوں ہرات کے بنے ہوئے ہیں، تقسیم تبرک کے بعد ہم
ہوٹل واپس آگئے۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد بقیہ مقامات و مزارات کو دیکھنے کے لیے نکلے۔ ہوٹل
کے باہر فٹ پاتھ پر سب مہمانوں کے جمع ہونے کے انتظار میں کھڑے تھے تو ایک نوجوان شخص
جس کی داڑھی بڑھی ہوئی اور کپڑے کچھ گندے تھے، میرے پاس آیا اور مجھے بغور دیکھ کر اس نے
اردو میں پوچھا کہ کیا آپ ہندوستان سے آئے ہیں؟ جب میں نے اثبات میں جواب دیا
تو اس نے بتایا کہ وہ حیدرآباد دکن کا رہنے والا ہے، اور ام۔ بی۔ بی۔ اس پاس ڈاکٹر ہے،
اُس کا نام اکبر علی ہے، وہ ملازمت کی غرض سے ایران گیا تھا، لیکن چونکہ اُس کے پاس
ٹورسٹ ویزا ہے ایران میں ملازمت نہیں مل رہی ہے، اگر عام طرز کا ویزا مل جائے تو اسے
ملازمت مل سکتی ہے، وہ اس قسم کا ویزا ہرات میں مقیم ایرانی قونصل سے حاصل کرنے کی
غرض سے آیا ہے لیکن دو تین روز سے قونصل سے ملاقات کی کوشش کر رہا ہے، قونصل
خانے کے چپراسی اسے قونصل سے ملنے نہیں دیتے اگر میری وساطت سے اُس کی مشکل حل ہو جائے
تو بہت ممنون ہوگا۔ میں نے اس کا پاسپورٹ دیکھنے کو مانگا تاکہ یہ اطمینان کر لوں کہ وہ
صحیح کہہ رہا ہے، اُس نے فوراً اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات دکھائے جنھیں دیکھ کر
اُس کی راست بیانی کا یقین ہو گیا، میں نے اُسے دلاسا دیا اور کہا کہ افغانستان میں ایرانی
کلچرل کونسلر (رایزن فرہنگی) ڈاکٹر حسین خدیوجم سے ملادوں گا جو ہمارے ساتھ

آئے ہوئے ہیں اُن کے ذریعے آپ کا کام ہو جائے گا، چنانچہ جب ڈاکٹر خدیوجم ہوٹل
سے باہر آئے تو میں نے ڈاکٹر اکبر علی صاحب کو ان سے ملا کر مدد کرنے کی سفارش کی،
انھوں نے ڈاکٹر منصوری کے نام جو ہرات میں ایرانی قونصل ہیں ایک سفارشی خط
لکھ دیا، اور یہ بھی وعدہ کیا کہ ملاقات کے وقت منصوری صاحب سے زبانی بھی سفارش
کر دیں گے، دوپہر کے کھانے کے وقت منصوری صاحب سے ملاقات ہو گئی اور انھوں نے
میرے سامنے ڈاکٹر اکبر علی کی سفارش کر دی۔ ایرانی قونصل نے مدد کرنے کا وعدہ کیا،
امید ہے کہ اکبر علی صاحب کو مطلوبہ ویزا مل گیا ہوگا۔

آج کے پروگرام میں سب سے پہلے ہم شیخ یحیٰی ابن عمار سجستانی کے مقبرے کی زیارت
کو گئے، شیخ ابن عمار سجستانی کا خواجہ عبداللہ انصاری کی تربیت و تقویت میں بڑا حصہ
ہے، جب تک وہ زندہ رہے کوئی شخص خواجہ انصاری پر بحث و مجادلہ میں غالب نہیں
آیا، ان کو لوگ خواجہ غلطان کہتے ہیں، ہرات کے لوگ اور زائرین قبر پر فاتحہ و دعا
کے بعد مزار کے پیچھے ایک چوکور گڑھے میں سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر زمین پر لوٹ لوٹ
کر آگے بڑھتے ہیں، اس طرح لوٹتے ہوئے اگر کوئی مغربی کونے پر پہنچ جائے، تو وہ اپنی مراد
حاصل کرلے گا۔ اور اگر شمال مغرب کونے پر جا پہنچے تو اُس پر خیرات واجب ہو جاتی
ہے، ہم لوگوں کے سامنے دو شخصوں نے لوٹ کر دکھایا۔

خواجہ غلطان کے مقبرے کی زیارت کے بعد ہم ایک اور بزرگ کے مزار کی زیارت
کو گئے، ان کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں، یہ مزار ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے جس پر
چڑھنا میرے لیے بہت دشوار تھا، اس لیے میں نے نیچے ہی سے فاتحہ پڑھ لینا مناسب
سمجھا، باقی لوگ موٹروں سے اُتر کر ٹیلے پر چلے گئے، میں نے اردگرد نظر ڈالی تو سامنے

دو تین مٹی کے مکانات دکھائی دئے، ایک کے دروازے پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی کسی کام میں مشغول تھیں، میں نے سوچا کہ جب تک ساتھی لوگ مزار کی زیارت کرکے واپس آئیں میں ان مکانات کے طرزِ تعمیر اور مکینوں کے وضع سکونت کا اندازہ کرلوں، چنانچہ میں نے موٹر ڈرائیور سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ مجھے ساتھ لیجانے پر راضی ہوگیا۔

یہ مکانات بیس پچیس قدم کے فاصلے پر تھے، ڈرائیور نے ان عورتوں سے کچھ کہا، دو عورتیں دوسرے مکان میں چلی گئیں اور میں ڈرائیور کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوا، اس مکان میں تین چار کوٹھریاں تھیں، جن کی دیواریں مٹی کی تھیں، چھت بھی مٹی کی اور قبہ دار، ایک کوٹھری کا قبہ گرگیا تھا، اس کوٹھری سے بھیڑوں کی بو آرہی تھی۔ غالباً یہاں بھیڑ رکھے جاتے ہوں گے، باقی کوٹھریوں میں کوئی سامان نظر نہیں آیا، ہر طرف خستگی اور افلاس کا سماں تھا، جو عورتیں دروازے پر بیٹھی تھیں، اور مجھے دیکھ کر ہٹ گئی تھیں ان کے لباس سے بھی ان کی غربت کا اندازہ ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سب لوگ فاتحہ پڑھ کر لوٹ آئے اور ہم سب موٹروں میں سوار ہوکر آگے چلے، چند منٹ میں فارسی کے مشہور شاعر اور نامور عارف و صوفی مولانا عبدالرحمٰن جامی (متوفی سال ۸۹۸ھ) کی آرام گاہ پر پہنچے جو ایک کھلے اور پُر فضا مقام پر واقع ہے، مرقد ایک سنگی چوکھٹے کے اندر ہے، جس کے چاروں طرف اشعار تحریر ہیں۔

لوح تربت پر سالہائے ولادت و وفات مرقوم ہیں۔ مزار پر پستہ کا درخت ہے جس سے قبر پر سایہ رہتا ہے، نیچے صحن میں اور بھی قبریں ہیں، ان ہی قبروں میں سے ایک قبر مقدمۃ الذکر بزرگ حضرت مولانا

عبدالرحمٰن جامی کے بھائی مولانا محمد (متوفی سنہ ۸۸۶ھ) کی اور دوسری ان کے بھانجے اور فارسی کے مشہور شاعر مولانا عبداللہ ہاتفی کی ہے۔ اسی مقام میں ایران کے باکمال مصور کمال الدین بہزاد (متوفی بسال ۹۴۲ھ) کی قبر بھی ہے۔ مقبرۂ جامی کے پچھم ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، جس کے رواق اور ایوان پر قرآن پاک کی سورتیں بخط طغرا اور جامی کے اشعار بخط نستعلیق لکھے ہوئے ہیں۔ مقبرۂ جامی کے متصل اتر جانب ایک باغ ہے، جسے دسویں صدی ہجری میں لگایا گیا تھا۔

آرام گاہ جامی کے قریب ہی بیس پچیس کیلومیٹر کی دوری پر امام فخرالدین رازی کی آرامگاہ ہے، اس کی وضع مقبرۂ جامی سے مشابہ ہے صندوق مزار کے چاروں جانب امام رازی کا سال ولادت و سال وفات تحریر ہے، اس قبر کے اوپر بھی ایک درخت پستہ کا سایہ ہے، مزار کے مغرب میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، جس کے ایوان و مدخل کی محرابوں پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں۔

ان مقبروں کی زیارت کے بعد ہم مصلا دیکھنے گئے، ایک مسجد نما عمارت تھی جسے ملکہ گوہر شاد نے بنوایا تھا، اب یہ عمارت ویران ہوچلی ہے، صرف ایک مینار باقی رہ گیا ہے۔ اسی کے متصل امیر علی شیر نوائی کا مقبرہ ہے جو ایک باغ میں واقع ہے، اسی باغ میں گنبد سبز کے نیچے ملکہ گوہر شاد کی آرام گاہ ہے، اسی مقام پر ملکہ کے بیٹے بایسنغر مرزا اور پوتے مرزا علاء الدولہ کی بھی قبریں ہیں۔ یہ علاقہ شہر کے بالکل متصل ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب مقابر و مساجد کی زیارت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور ہم ہوٹل موفق کو واپس آگئے، یہیں یہ ہدایت دی گئی کہ ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد اپنے سامان سمیت ہم باغ جمہوریت چلیں گے، جہاں "تخت صفر" میں والی ہرات کی

طرف سے چاشت کی دعوت ہے، پھر وہاں سے سیدھے ہوائی اڈے کو روانہ ہونگے، چنانچہ اسی ہدایت کے مطابق ہم ساڑھے بارہ بجے "باغ جمہوریت" پہنچ گئے، یہ نہایت دلکش باغ ہے جس میں سرسبز پیڑ پودے اور خوشنما پھول لگے ہوئے ہیں، اس کے ایک کنارے ایک دومنزلہ عمارت "تخت صفر" نامی ہے۔ اسی عمارت کی بالائی منزل پر ہمیں لیجا کر بٹھایا گیا، جہاں بہت سے مقامی معزز اصحاب بھی موجود تھے، ہمارے سامنے پستہ، بادام اور ٹافی کی تشتریاں میزوں پر رکھی تھیں تاکہ ہم کھانا شروع ہونے سے پہلے ان سے شغل کرتے رہیں، موسیقی اور تفریحی پروگرام بھی تھا، ایک شخص نے چڑیوں کی آوازوں کی نقلیں بڑی خوبی کے ساتھ اُتاریں، پھر غزلیں سنائی گئیں اور ایک ریڈیو آرٹسٹ نیلو محبوب نے خواجہ عبد اللہ انصاری کی مناجات اور الٰہی نامہ کے کچھ حصے دلکش لہجے میں سنائے، اس کے بعد ہم نچلی منزل میں گئے جہاں ایک ہال میں میزوں پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر ہم پھر اوپر کی منزل پر گئے، یہاں ہماری تواضع آئس کریم سے کی گئی۔ آخر میں والی ہرات جناب غلام علی آئین نے بیرونی مہمانوں کو نام بنام پکار کر کاٹھ کا ایک بند ڈبہ منقش کاغذ میں لپٹا ہوا تحفۃً عنایت کیا، ایک صاحب نے اسے وہیں کھول کر دیکھا تو اس میں شیشے کا ایک گلدان ملا جس میں روغن چڑھایا ہوا ہے اور "بیادگار ہزارویں سال تولد خواجہ عبد اللہ انصاری" تحریر ہے، ہم نے یہ تحفہ شکریے کے ساتھ لیا اور رخصت ہوکر تقریباً ڈھائی بجے ہوائی میدان پہنچ گئے، والی ہرات بھی ہم لوگوں کو الوداع کہنے یہاں تک آئے، لیکن معلوم ہوا کہ کابل کا موسم خراب ہے، طوفانی ہوا چل رہی ہے، ایسی حالت میں طیارہ کو پرواز کرنے کی اجازت نہیں ہے، تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی یہی

رپورٹ ملی، مجبوراً ہم لوگ پھر ہوٹل موفق کو واپس چلے آئے اور طے پایا کہ کل صبح سویرے پھر ہوائی میدان چلے چلیں گے۔ مقررہ پروگرام میں خلل پڑجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کو کابل میں ایرانی سفارت خانے میں مہمانوں کی پذیرائی کے لیے جس ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا ہم لوگ اس میں شریک نہ ہو سکے۔

جس وقت ہم لوگ ہوٹل موفق کو واپس آئے چار بج چکے تھے ابھی شام ہونے میں خاصی دیر تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ اس مہلت میں ہرات کے بازار کی سیر کرلی جائے، چنانچہ میں اور ایک عراقی نمایندہ ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری، افغانی میزبان ڈاکٹر امیر محمد اثیر کی رہنمائی میں ہوٹل ہی کے آس پاس جو بازار کا علاقہ ہے اس کو دیکھنے نکلے، یہ بازار ایک کشادہ سڑک کے دونوں جانب واقع ہے، دونوں طرف پیادہ رو یعنی فٹ پاتھ بھی ہیں۔ ہم کئی دکانوں میں گئے خصوصاً کپڑوں کی دکانوں میں یہاں بیرونی ممالک کے منسوجات خاصی مقدار میں موجود ہیں، ڈاکٹر العمری نے جاپان اور ایران کے بنے ہوئے اطلس اور ریشمی کپڑے خریدے، ہم ایک کتاب فروش کی دکان میں بھی گئے، یہاں زیادہ تر ایرانی مطبوعات فروخت کے لیے موجود تھیں۔ دکانوں میں خریداروں کی اچھی خاصی تعداد دیکھی، فٹ پاتھ پر بھی دست فروشوں کی دکانیں ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے ہمارے ہندوستان کے شہروں میں دیکھی جاتی ہیں۔ بازار کی ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ سب دکانیں ایک قطار میں ہیں اور بیشتر میں شیشے لگے ہوئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں برف باری ہوتی ہے۔

مغرب کے وقت ہم ہوٹل لوٹ آئے، رات گذار کر صبح کو ناشتہ کے بعد ہم پھر ہوائی اڈے کو روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کابل کا موسم ہنوز خراب ہے، اور

وہاں طیارہ نہیں اُتر سکتا۔ اب سب لوگ شش و پنج میں پڑ گئے کہ کیا کیا جائے، قافلہ کے
سربراہ ڈاکٹر روان فرہادی نے کابل میں وزیر اطلاعات سے بذریعہ وائرلیس رابطہ
قائم کرکے رائے پوچھی، انھوں نے مشورہ دیا کہ ہوائی جہاز کا پائلٹ جو کہے اس پر عمل کرنا
چاہیے، پائلٹ کی رائے یہ تھی کہ کابل جانا تو ممکن نہیں ہے، قندھار کا موسم بھی خراب ہے
طیارہ قندھار جا سکتا ہے، وہاں پہنچ کر اگر اس وقت تک موسم موافق ہوگیا تو کابل کی
طرف پرواز کی جائے گی، چنانچہ ہم لوگ طیارہ میں سوار ہوگئے اللہ کا نام لے کر پرواز شروع
کی گئی، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارا طیارہ چھوٹا صرف ایک انجن والا تھا، اس لیے زیادہ
بلندی پر پرواز نہیں کرتا تھا، لہٰذا زمین پر کی چیزیں دھندلی دکھائی دیتی تھیں۔ راہ میں
معلوم ہوا کہ ہم چشت کے اوپر سے پرواز کر رہے ہیں، چشت سے میرا روحانی تعلق ہے،
میری نانی مرحومہ کے اسلاف حضرت خواجہ مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں سے تھے
میرا ارادہ تھا کہ میں چشت کی بھی زیارت کروں گا، لیکن یہ تمنا پوری نہ ہوسکی، پھر کچھ
دیر کے بعد معلوم ہوا کہ ہم مزار شریف کے قریب سے پرواز کر رہے ہیں، مزار شریف
افغانستان کا مقدس شہر ہے، مشہور ہے کہ یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار مبارک
ہے جس پر ایک بہت ہی حسین اور شاندار عمارت بنی ہوئی ہے ہر سال یہاں ہزاروں زائرین کا
نوروز میں اجتماع ہوتا ہے۔ یہ شہر بھی قابل دید ہے، کچھ آگے بڑھنے پر یک بیک نظروں کے سامنے
پہاڑوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی زرد زرد ٹیڑھی میڑھی ایک چوڑی
لکیر نمایاں ہوئی، یہ اس علاقے کی مشہور اور ایرانی تاریخ ادب کی معروف ندی جیحون
تھی جسے یونانی زبان میں اوکسس کہتے ہیں اور جس کا قدیمی اور موجودہ نام آمو دریا ہے
اس کے داہنے کنارے پر ماوراءالنہر کی سرزمین اور سمرقند اور بخارا کے مشہور شہر ہیں

یہی وہ ندی ہے جس کے بارے میں رودکی نے کہا تھا۔

ریگ آموو درشتی ہای آن   زیر پایم پرنیان آید ہمی

آمو دریا کا یہ ریگ دور دور اور خاصی دیر تک دکھائی دیتا رہا۔ اس کی
چمکیلی اور زرد ریت اس ماحول میں جاذب نگاہ تھی، ندی میں اس وقت پانی
کم رہا ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا، کیونکہ جو چیز دکھائی دیتی تھی وہ تھی صرف ریت،
آمو دریا جبال غور سے نکلتی ہے، اور اپنی ساتھی ندی سیحون (سیر دریا) سے مل کر
دریاچۂ ارال میں جا گرتی ہے۔

تقریباً دو گھنٹے پرواز کے بعد ہمارا طیارہ قندوز کے ہوائی میدان میں جا اترا،
اس علاقے کے حاکم نے جسے ہماری آمد کی خبر قبل ہی سے ہوگئی تھی، ہمارا خیر مقدم کیا
اور ہم ہوائی اڈے کی بس میں سوار ہوکر ایک مہمان خانے میں گئے، جو شہر سے باہر
ہے، یہاں ہماری خاطر بسکٹ، نانی اور چائے سے کی گئی، یہاں ہم نے تھوڑی دیر
اس انتظار میں توقف کیا کہ شاید طیارہ کے لیے کابل تک پرواز کرنے کی صورت
نکل آئے، لیکن ایک بجے تک یہ خبر ملتی رہی کہ ہنوز موسم موافق نہیں ہوا ہے، اور
نہ آج اس کے ہونے کی امید ہے، مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم لوگ سڑک کے ذریعے
کابل کا سفر کریں، چنانچہ ہم لوگ پھر بس میں بیٹھ کر شہر کے چوک میں پہنچے جہاں کابل
جانے کے لیے ایک بس کا انتظام کرنا تھا، یہاں ہمیں اس کی اجازت ملی کہ
ساعت تک بازار کی سیر کریں۔

قندوز کابل سے تقریباً تین سو کیلومیٹر شمال میں روس کی سرحد کے قریب ایک
تاریخی شہر اور ولایت قندوز کا صدر مقام ہے، یہ ترکستان کے اس حصے میں واقع ہے

جو افغانستان کے اندر ہے، شہر خوبصورت اور سرسبز باغات سے بھرا ہوا معلوم ہوا، بازار میں بھی خاصی رونق دیکھی، دکانیں چوڑی سڑکوں کے دونوں جانب ہیں، انکے سامنے چوڑے فٹ پاتھ بھی ہیں، دکانوں میں مال و اسباب بھرا ہوا پایا، خریداروں کی بھی تعداد کثیر تھی، دست فروشوں کی بھی کثرت تھی، چوک پر جو ٹریفک کے سپاہی تھے انھوں نے ہمارا سامان اپنی نگرانی میں رکھ لیا تھا، تاکہ ہم آزادی سے گھوم پھر سکیں،

دو بجے کے قریب ہم لوگ ایک آرام دہ بس میں سوار ہو کر کابل کی طرف روانہ ہوئے، مجھے یہ خوشی تھی کہ بس کے ذریعہ سفر کرنے سے افغانستان کے کچھ اور علاقوں کو دیکھنے کا موقع ملے گا جو طیارہ سے ممکن نہ تھا، شہر سے نکل کر ہم ایک عمدہ پختہ سڑک پر ہو لئے، یہ سڑک روسیوں کی مدد سے سرحد روس سے کابل تک بنی ہوئی ہے، اور بڑے اونچے پہاڑوں پر سے گذرتی ہے، کچھ دور تک ہم نسبتہ نشیبی علاقے میں چلتے رہے، ہمارے راستے میں دلفریب قدرتی مناظر تھے، پہاڑوں کا سلسلہ، جھرنے، مترنم ندیاں، اُن کے کنارے کنارے سرسبز کھیت اور باغ، ہم بغلان کے تاریخی مقام اور ایک مشہور شہر "پُل خُمری" سے بھی گزرے، آہستہ آہستہ سڑک بلندیوں پر چڑھنے لگی، اور ایک گھنٹے میں ہم خاصی بلندی پر پہنچ گئے، ایک جگہ بارش ہونے لگی، اور ہماری بس ایک "چائے خانہ" کے پاس ٹھہر گئی، افغانستان کے چائے خانے مشہور ہیں، اور افغانیوں کی زندگی میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں، یہ چائے خانے سوشل اجتماعات کے مراکز ہیں، جہاں لوگ جمع ہو کر چائے پینے کھانا کھاتے اور باہمی دلچسپی کے موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں، ہم بارش میں بھیگتے ہوئے چائے خانے میں داخل ہوئے جہاں مٹی کے ایک لمبے چبوترے پر لوگ بیٹھے مٹی یا چینی کے

پیالوں میں چائے نوشی میں مشغول تھے، نزدیک ہی تنور سی چیز میں آگ روشن تھی جس پر کیتلی رکھی تھی، اور اس سے گرم گرم چائے لوگوں کو تقسیم ہو رہی تھی، افغانستان میں دو قسم کی چائے ملتی ہے، چائے سبز اور چائے سیاہ، چائے سبز وہی ہے جسے ہم گرین ٹی کہتے ہیں، اور چائے سیاہ وہ ہے جو ہمارے یہاں مروج ہے، لیکن دونوں کا رنگ ہلکا ہوتا ہے، اور دودھ ڈالے بغیر پی جاتی ہیں۔ مجھے چائے سبز کا ذائقہ پسند نہیں آیا، اس لیے میں نے ایک دفعہ چکھنے کی خاطر پینے کے سوا پھر کبھی نہ پی۔ چائے پینے کے بعد ہم پھر بس میں سوار ہو کر چلے، اب ہماری بس اور زیادہ بلندی پر چڑھتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ ہم اتنی بلندی پر پہنچ گئے جہاں ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی، سڑک کئی سرنگوں سے گزرتی ہے، سرنگوں کی چھتوں پر بھی برف جمی ہوئی تھی، بلکہ سوراخوں سے کچھ برف سرنگ کے اندر بھی گری ہوئی تھی، سب سے زیادہ بلند اور برف آلود مقام سالن ہے۔ اس علاقے کو دیکھ کر مجھے ایران کے مغربی پہاڑوں کا سماں یاد آگیا۔ بغداد سے بذریعہ سڑک آتے ہوئے کرمانشاہ کے نزدیک ایسا ہی منظر دیکھنے میں آیا تھا، جہاں کوسوں تک سڑک کے دونوں کنارے زمین برف سے پٹی ہوئی تھی۔

ان دشوار گذار منازل کو طے کر کے ہم نشیب کی طرف چلے اور پہاڑوں کے چکر دار راستوں سے ہوتے ہوئے ہموار سڑک پر آگئے، کابل پہنچتے پہنچتے چراغ روشن کیے جا چکے تھے، ساڑھے سات بجے کے قریب ہماری بس انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل کی پورٹیکو میں آکر رک گئی، ہماری مہماندار مس سیریں تاج اور عثمانی صاحب لپک کر میرے پاس آئے اور ہم لوگوں کے پروگرام کے مطابق کابل نہ پہنچنے سے جو انھیں تشویش لاحق ہو گئی تھی اس کا اظہار کیا۔ اس تاریخ کو افغانستان ریڈیو اسٹیشن کے ہال میں ایک شاعرے کا

اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن ہم لوگوں کی عدم موجودگی میں اس پروگرام کو منسوخ کر دیا گیا تھا، البتہ اس وقت انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل کے بالائی طبقے کے ڈائننگ ہال میں وزیر اطلاعات کلتور کی طرف سے شاندار الوداعی ضیافت تھی، چنانچہ ہم لوگ اپنے اسباب کمروں میں رکھ اور منہ ہاتھ دھو کر اس ضیافت میں شریک ہوگئے۔

دوسرے دن، ۱۲ مئی کو تقریب کا آخری جلسہ صبح کو ہوا، اس جلسے کی صدارت مسٹر معظم حسین نے کی جو حیدرآباد دکن کے رہنے والے ہیں اور یونسکو کی جانب سے مختلف ممالک میں ٹیچروں کے ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے مقرر ہیں۔ فی الحال وہ افغانستان میں متعین ہیں، اس جلسے میں باقی ماندہ تین مقالے پڑھے گئے جس کے بعد سمنار کے سکریٹری نے مہمانوں کی خدمت میں اظہار تشکر کے ساتھ تقریب کے خاتمے کا اعلان کیا۔ بعد ازاں ہم لوگوں نے دن کا کھانا کھایا، پھر ایک دوسرے کو الوداعی سلام کر کے رخصت ہوئے۔

ابھی دن کے چند گھنٹے باقی تھے، اس لیے میں نے اپنی مہماندار مس شیریں تاج سے درخواست کی کہ وہ مجھے بازار لے چلیں تاکہ میں افغانستان کے کچھ میوے خرید لوں وہ راضی ہوگئیں اور ہم دونوں بازار پہنچے تھوڑی خریداری کر کے وہ مجھے انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل پہنچا کر کل صبح آنے اور مجھے ہوائی اڈے پہنچانے کا وعدہ کر گئیں۔

شام ہونے کو ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، میں نے سوچا کہ اس وقت کو ہوٹل سے باہر جا کر صرف کر دوں، اس ارادے سے میں ہوٹل سے نکل کر نیچے کی طرف چلا، سڑک اس قدر ڈھلوان تھی کہ مجھے جابجا رک کر چلنا پڑا، یہ سڑک نیچے آکر عام شاہراہ میں مل جاتی ہے۔ یہاں سے ایک دوسری سڑک باغ بالا کو جاتی ہے، میں نے دیکھا کہ

بہت سے لوگ مرد، عورت، بچے، پاپیادہ، یا موٹروں اور سائیکلوں پر اس سڑک سے اوپر جا رہے ہیں، اور کچھ نیچے بھی اتر رہے ہیں، بسیں بھی دونوں طرف سے بھری بھری آتی جاتی تھیں، لوگ ان سے اتر اتر کر باغ بالا کی طرف جاتے تھے، آخر میں نے ایک نوجوان آغا سے دریافت کیا کہ اوپر کیا چیز ہے، جسے دیکھنے کے لیے لوگ جا رہے ہیں، اس نے بتایا کہ اوپر بلندی پر ایک بزرگ کا مزار ہے، آج جمعہ کا دن ہے لوگ وہاں فاتحہ خوانی کیلئے جاتے ہیں، اور وہاں میلا لگتا ہے، میں اس جگہ کچھ دیر تک کھڑا آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا، ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں جو موڈرن فیشن کا لباس پہنے تھیں، یعنی بل باٹم یا پینٹ اور چست گنجی اس کا مطلب یہ کہ امریکی لباس دنیا کے اس گوشے اور کوہستانی ملک افغانستان میں بھی مروج ہو گیا ہے۔!

دوسرے دن کابل سے وطن کو واپسی تھی، خانم شیریں تاج صبح کو ۹ بجے کار لے کر ہوٹل میں آگئیں اور ہم اسباب موٹر میں رکھ کر اور ہوٹل والوں سے رخصت ہو کر ہوائی اڈے پہنچ گئے، جناب عثمانی اور ایک افغانی دوست جناب استاد محمد صالح پرونتا اور مدیر تشریفات خانم گل غوتی رخصت کرنے ہوائی اڈے آگئے تھے، پاسپورٹ و دیگر کاغذات اور کسٹمس چیکنگ کے بعد میں ان دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر لانچ میں آگیا، اس وقت تک طیارہ تہران سے نہیں آیا تھا، اس لیے کچھ دیر ٹھہرنا پڑا، تقریباً گیارہ بجے طیارہ آگیا تو سب مسافر سوار ہوئے اور دہلی کی طرف پرواز شروع ہوئی۔ ڈیڑھ گھنٹے میں طیارہ پاکستان کی سرزمین کو عبور کرتا ہوا، پالم ایرپورٹ پر اتر آیا۔ اس طرح افغانستان کی مسافرت تمام ہوئی۔

افغانستان میں میری اقامت کی مدت بہت مختصر رہی، یعنی جمعہ جمعہ آٹھ دن

لیکن اس مختصر مدت میں بھی جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا اس سے میں نے اس
ملک کے سماجی و علمی حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، میں نے اتنا احساس تو ضرور
کیا کہ یہ ملک موجودہ جمہوری دورِ حکومت میں ترقی و خوشحالی کی طرف گامزن ہے، صدر
جمہوریہ افغانستان جناب داود خاں عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کی رونق بڑھانے
میں ساعی ہیں، سب سے زیادہ خوش نصیبی کی بات میرے لیے یہ ہوئی کہ چند یوروپی
دانشوروں کے علاوہ افغانستان کے متعدد دانشمندوں اور اساتذہ کرام سے ملاقات و
گفتگو کا موقع میسر آیا، ان افغانی دانشمندوں میں پرانے لوگ بھی ہیں اور نوجوان بھی، بیشتر
لوگوں میں استاد عبدالحی حبیبی ایک محقق دانش پرداز کی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں،
انھوں نے خواجہ عبداللہ انصاری کے ملفوظات و تالیفات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور
طبقات الصوفیہ کو بڑی کاوش و کوشش سے ایڈٹ کیا ہے۔ دوسرے جناب عبداللہ
خدمت گار ہیں جو فی الحال پشتو اکیڈمی کے معزز رکن ہیں، شاعر بھی ہیں، اور انشا پرداز
بھی، ان کی علمی و ادبی کوششیں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، جناب عبدالوہاب
محمود طرزی ملک کے مشہور و معروف محب وطن و قومی رہنما محمود طرزی مرحوم کے فرزند
ارجمند ہیں، ان کے علمی کارنامے معیاری سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے حکیم ناصر خسرو کے
کے متعلق بڑی تحقیق و تفتیش سے ایک کتاب مرتب کی ہے، ڈاکٹر امیر محمد اثیر علم طب
میں ڈاکٹر ہیں، لیکن انھیں قدرت نے علمی و ادبی ذوق بھی عطا کیا ہے، عبدالقادر بیدل
کے کلام کے دلدادہ ہیں اور اس کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ان کا مقالہ بھی بیدل ہی سے متعلق
ہے، جناب محمد علم غواص کو ہرات کے مزارات اور تاریخی مقامات کے متعلق وسیع و مفید
معلومات حاصل ہیں، انھوں نے ہرات میں اپنی معلومات سے ہمیں مستفید کیا، جناب

غلام حسین مجددی ہندوستان میں افغانستانی سفارت خانے سے مدت تک منسلک
رہ چکے ہیں، اس لیے اردو اچھی طرح بولتے ہیں، اُن کا علمی ذوق گفتگو میں ظاہر ہوتا ہے،
جناب رضا مائل ہروی انجمن تاریخ کے معزز رکن تھے، انھوں نے کئی تحقیقی کارنامے انجام
دئے ہیں، جن میں بعض بنیاد فرہنگ ایران کی طرف سے شائع ہوئے ہیں، چند سال
قبل اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں پٹنہ بھی آئے تھے۔ سب سے دلچسپ اور قابل توجہ
شخصیت جناب استاد محمد صالح پرونتا کی دیکھی۔ پہلے دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی
کابل میں استاد تھے، اب متقاعد ہو چکے ہیں، انھیں بے شمار اشعار فارسی یاد ہیں،
ہر موقع اور موضوع کے لیے شعر سنا دیتے ہیں، کہتے تھے کہ انھیں تقریباً دس ہزار
اشعار یاد تھے، اب بسبب کہنسالی کچھ بھولتے جاتے ہیں۔ بذلہ سنج اور خوش مزاج
و حاضر جواب ہیں کوئی موقع ہو فقرہ چست کرنے یا شعر سنانے سے نہیں چوکتے، بڑے
علم پرور اور کتاب دوست ہیں۔ ان کا شخصی کتاب خانہ ہے، جس میں چھ سات ہزار
قلمی نسخے ہیں ان میں سے بعض نادر و نفیس ہیں، انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کی تاریخ سے
متعلق ان کے کتاب خانے میں بعض نادر مخطوطات موجود ہیں، مجھکو دعوت دی تھی کہ ان کے
گھر جاکر کتاب خانے کو دیکھوں، لیکن ہرات میں اٹک جانے کی وجہ سے اس کا موقع نہ
مل سکا جس کا مجھے بیحد افسوس ہے، ڈاکٹر نبی ہادی ریڈر شعبۂ فارسی، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی
نے گذشتہ سال جب وہ ایک بین الملکی کانفرنس میں شرکت کے لیے کابل گئے تھے
آقاے پرونتا کا کتاب خانہ دیکھا، اور اپنے ایک مضمون میں اس کی تعریف کی ہے،
کاش اس کتاب خانے کی فہرست شائع ہو جاتی میں نے آقاے پرونتا کو اس بات پر
راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ جلد ایک فہرست مرتب کرکے چھپوا دیں، وہ

مجھ سے بہت خلوص سے ملے اور مجھ کو رخصت کرنے کابل کے ہوائی میدان بھی آئے۔

نوجوان دانشمندوں میں دو شخصوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ایک تو ڈاکٹر عبدالغفور روان فرہادی جو سمنار کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہر وقت انتظام و اہتمام میں مشغول رہتے تھے، بہت ہی فعّال آدمی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ علمی دنیا میں بھی نام آور ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف ہیں، انگریزی میں بھی مضامین لکھتے ہیں، اور فرانسیسی بے تکان بولتے ہیں، انھوں نے خواجہ عبداللہ انصاری کے حالات زندگی و آثار سے متعلق فرانسیسی دانشمند سرژ بورکوئی کی تالیفات کا زبان دری (فارسی) میں ترجمہ کیا ہے۔ پوری تقریب میں ان کی فعالیت نمایاں رہی، اگر انھیں سمنار کا روح و رواں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، دوسرے نوجوان جناب ڈاکٹر سید مخدوم ہیں، جو کابل یونیورسٹی میں استاد ہیں، بڑے ذی علم، ذہین اور تیز آدمی ہیں، سمنار میں جتنے موضوعات زیر بحث آئے انھوں نے بیشتر موضوعات پر بحث میں حصہ لیا، وہ بہت ہی مدلل طریقے پر اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، عربی بھی بلا تامل بولتے ہیں، فارسی ادب میں ایران سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ اس لیے اس زبان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں،

اس وقت افغانستان میں دو زبانیں رائج ہیں، ایک تو پشتو جسے اب سرکاری زبان بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس لیے اس کی ترقی کے لیے تمام وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں، ایک پشتو اکیڈمی بھی قائم ہے جو درسی اور علمی کتابوں کو پشتو میں ترجمہ کرا رہی ہے، اس نے خاصی تعداد میں کتابیں شایع کی ہیں۔ دوسری زبان فارسی ہے جو زمانۂ دراز سے اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے، لیکن فارسی کو یہاں دری کہتے ہیں، اور افغانی اسے دری کہنے میں حق بجانب بھی ہیں، کیونکہ اگر وہ اس زبان کو

جو بیشتر لوگوں کی مادری زبان ہے، فارسی کہیں گے تو یہ ایران کی زبان ہوگی نہ کہ افغانستان کی، پھر فارسی زبان کا اصلی نام تو دری ہے، کیونکہ یہ درہ ہائے کوہستان میں پیدا ہوئی، اور مشرق کے خودمختار حکمرانوں کے درباروں میں پہنچ کر ایک علمی و ادبی زبان کی صورت میں ترقی پذیر ہوئی، الفاظ و محاورات اور لہجے کے اعتبار سے ایرانی فارسی اور افغانی دری میں خاصا فرق ہے۔

میں نے افغانستان کے تعلیمی حالات کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کی، جہاں موقع ملا میں نے بچوں سے دریافت کیا کہ وہ کیا پڑھتے ہیں، اور کہاں پڑھتے ہیں، استالیف میں ایک لڑکا نو دس سال کا مہمان خانے کے باغ میں کھیلتا ہوا ملا، میں نے اس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی پبلک اسکول میں پڑھتا ہے، اور فرانسیسی زبان سے واقف ہے، گازرگاہ میں دو خورد سال لڑکے ہم لوگوں کے نزدیک تماشا دیکھنے آ گئے تھے، میں نے ان سے پڑھنے لکھنے کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ وہ مکتب میں پڑھتے ہیں، میں نے دریافت کیا کہ قرآن پاک پڑھتے ہو کہ نہیں، تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور میرے کہنے پر سورہ الحمد زبانی سنایا۔ یہ بھی بتایا کہ اسے علم الحساب بھی سکھایا جاتا ہے، کپڑے کی ایک دکان پر ایک لڑکا ملا، اس نے بھی اسی قسم کا جواب میرے سوالوں کا دیا، میں نے کابل، ہرات اور قندوز میں لڑکیوں کو کتابوں کا بستہ سنبھالے اسکول یا مدرسے سے آتے دیکھا، ان لڑکیوں کی عمر آٹھ دس سال ہوگی، ان لڑکیوں کا اسکولی لباس یہ ہے، نیلے رنگ کا جمپر، اسی رنگ کا شلوار اور سفید دوپٹہ، جو سر سے اوڑھا ہوا تھا، ان اسکولی لڑکیوں کی تعداد بھی خاصی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں بھی تعلیم کی طرف متوجہ ہیں، سمنار کے جلسوں میں کابل یونیورسٹی کے بعض لڑکے اور لڑکیاں

مقالہ خوانی کا تماشا دیکھنے آجاتی تھیں، میں نے ان سے بھی ان کی تعلیم کے متعلق سوالات کیے، وہ سب رشتۂ ادبیات یا تاریخ سے وابستہ تھے، بعض لڑکیاں تعلیم حاصل کرکے سرکاری دفتروں میں ملازمت کرتی ہیں، چنانچہ وزارت اطلاعات وکلتور میں متعدد لڑکیاں ملازم ہیں، اور یہی بیرونی مہمانوں کی رہنما بنائی گئی تھیں۔ مس شیریں تاج، مس عایشہ، مسز طاہرہ، مسز لیلا، مس ملیحہ صیقل، مس ثریا زکریا، مسز شہلا سمیعی، یہ سب دفتر میں ملازم ہیں، اور میں نے انھیں بہت ہی تیز و طرار، اور شوخ و شنگ پایا، ان کا لباس بھی مغربی وضع کا تھا، میری ملاقات دو شاعرات سے بھی ہوئی، ایک تو عاطفہ عثمانی اور دوسری رؤفہ احراری۔ دونوں نے اپنے شعر بھی لکھ کر یادگار کے طور پر دیے، عاطفہ عثمانی نے یہ دو شعر لکھے۔

زن ای نہال مثمر دنیاے زندگی — زن اے چراغ روشن شب ہاے زندگی
گر عاشقم بروے تو از بسکہ خواندہ ام — بر صفحہ جبین تو معناے زندگی

رؤفہ احراری نے یہ فرد لکھا۔

خون دل بود انکہ رنگ لالہ را ایجاد کرد — اشک خونینم شفق را درافق بنیاد کرد

سمنار میں شریک ہونے والوں کو بہت سی کتابیں بھی بطور تحفہ دی گئیں، ان میں سے کچھ تو انجمن تاریخ کی مطبوعات ہیں، کچھ موسسۂ بیہقی کی، کچھ پشتو اکیڈمی کی اور کچھ کابل یونیورسٹی کی۔ موسسۂ بیہقی کی نو کتابیں ہیں جن میں سے آٹھ خواجہ عبد اللہ انصاری کے احوال و آثار سے متعلق ہیں، ان میں سے ایک منازل السائرین ہے، اور ایک حکیم ناصر خسرو بلخی کے احوال و آثار کے متعلق ہے، پشتو اکیڈمی کی شائع کردہ تیس جلدیں ملیں، ان میں سے ایک مولانا شبلی نعمانی مرحوم و مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

کی مشہور تالیف سیرۃ النبی کا پشتو ترجمہ ہے جس کو عزیز الرحمٰن سیفی نے کیا ہے، یہ کتاب بڑی تقطیع پر چھپی ہے، اور چھ جلدوں میں ہے، (مجھے پانچویں جلد نہیں ملی) ان کتابوں کے علاوہ مجلہ آریانا، مجلۂ ادب، مجلہ عرفان اور انگریزی مجلہ افغانستان کے کئی شمارے بھی تحفتہً عنایت کیے گیے۔

کابل کے اخبار انیس، جمہوریت، اور کابل ٹائمز (انگریزی) نے سمنار کی رپورٹ بہت مفصل طور پر چھاپی، اور اُن کی کاپیاں سب مہمانوں کو تقسیم کیں، اخبار انیس سراسر زبان دری میں نکلتا ہے، اخبار جمہوریت میں پشتو اور دری دونوں زبانوں میں خبریں ہوتی ہیں، یہ تینوں روزنامے ہیں۔ ہرات سے روزنامہ اتفاق اسلام شائع ہوتا ہے، اس نے بھی تقریبات کی مفصل خبریں شائع کیں۔

افغانستان کی ہشت روزہ مسافرت میں صرف پانچ دن کابل میں رہنے کا موقع ملا، اس کا بھی بیشتر حصہ سمنار میں مشغولیت اور دعوتوں میں شرکت کی نذر ہوگیا، اسلیے شہر کو اچھی طرح دیکھنے کا وقت میسر نہ ہوسکا۔ ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل سے پریس کلب (تالار محمود طرزی) تک آتے جاتے یا شہر سے باہر استالیف کی راہ میں یا دو دن کابل کے ایک بازار میں مختصر وقت میں خریداری کے موقع پر جو کچھ دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ کابل اور اُس کے گرد و نواح کو قدرت نے حسین مناظر سے آراستہ کیا ہے شہر ایک زرخیز وادی میں ہے، جو چھ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع ہے اور دو بلند پہاڑ اس کے دو جانب کھڑے ہیں، کابل ندی شہر کے مختلف حصوں سے گزرتی ہے، اور اس پر جا بجا پل ہیں، کابل جدید کی سڑکیں بہت ہی کشادہ اور صاف ستھری ہیں، بہت سی سرکاری دفتروں اور ہوٹل کی عمارتیں جدید طرز کی ہیں، کابل کے بازار میں اجناس

فروخت فراوانی کے ساتھ دکانوں میں ہیں، اور خریداروں کی بھی کثرت ہے، پہاڑ کے ڈھلوان پر بھی جابجا مکانوں کے جھنڈ ہیں، جو مکھی کے چھتے کی طرح معلوم ہوتے ہیں، رات کو جب روشنی ہوتی ہے تو ان کا دلکش منظر ہوتا ہے۔

افغانستان میں جو مختصر سی اقامت کا موقع ملا اس کو اب یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جو کچھ دیکھا خواب تھا، جو سُنا افسانہ تھا، لیکن افغانی دوستوں کی قدردانی، مہمان نوازی اور مخلصانہ گفتگو ہمیشہ یاد رہے گی۔

حیاتِ سلیمان

یہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی محض سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگون مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے، جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے اسی کے ساتھ دار المصنفین کی تاسیس، سال بسال اس کی ترقی کی تاریخ، اور پھر اپنی آخر زندگی میں پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، ان کا بھی ذکر آگیا ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ، دلچسپی ہی پر از معلومات، دلکش اور قابل مطالعہ ہے،

مولفہ۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی،

صبح الاعشیٰ

از۔ محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے (علیگ)

(۲)

صبح الاعشیٰ نہ صرف مصنفات قلقشندی کی کہکشاں میں کوکب تاباں کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان و ادب کا پورا سرمایہ اس کی نظیر سے عاری ہے، کسی ایک خاص فن پر ممکن ہے، اس سے ممتاز اور فائق تصنیف مل جائے، لیکن مختلف علوم و فنون کا جو سمندر صبح الاعشیٰ کے ضخیم دفتر میں موج زن ہے، وہ بلاشبہ مفقود المثال ہے، اسی باعث اس کتاب کو عربی علم ادب میں لازوال شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، ابو العباس قلقشندی نے یوں تو فقہ، ادب، انساب، رجال اور تاریخ میں بکثرت لائق ذکر کتابیں تالیف کی ہیں، جیسا کہ گذشتہ سطور سے واضح ہو چکا ہے۔ لیکن جس کتاب نے مسلمہ طور پر اس کو بقائے دوام کے دربار میں کرسی زرنگار پر متمکن کیا، وہ صبح الاعشیٰ ہے، یہاں تک کہ اب یہ دونوں نام لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک کے تصور کے ساتھ دوسرا خود بخود پردۂ ذہن پر ابھر آتا ہے۔ ایک نقاد نے بہت صحیح لکھا ہے،

لا یشک احدٌ فی ان کتاب
صبح الاعشیٰ ہو اخطر کتب
علی الاطلاق وھذا الکتاب

بلاشبہ صبح الاعشیٰ متفقہ طور پر سب سے
اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے باعث
قلقشندی زمانہ دراز تک مشہور رہیگا،

الذی یعرف بہ ھذا الرجل عبر العصور ویذکر بہ دائماً بین المؤلفین فی سائر الدھور فلا یمر اسم القلقشندی فی مجال من مجالات العلم والادب الا علی انہ مؤلف صبح الاعشی وکفیٰ۔[1]

اور اس کی وجہ سے وہ ابدالاباد تک تمام مؤلفین کے ساتھ یاد کیا جائے گا، چنانچہ علم و ادب کے میدان میں قلقشندی کا نام صرف صبح الاعشیٰ کے مؤلف ہی کی حیثیت سے معروف ہے، اور یہ کافی ہے۔

صبح الاعشیٰ کا بنیادی موضوع جو اس کے مولف کے پیش نظر تھا، فن انشاء ہے، لیکن اس انشاء سے مقصود انشاپردازی، محاسن اسلوب اور طرز نگارش نہیں ہے، جیسا کہ اس زمانہ میں معروف ہے، بلکہ اس سے وہ مجموعۂ علم و فن مراد ہے، جس کی واقفیت ایک سرکاری سکریٹری کے لیے اپنے فرائض کی بجاآوری میں لازمی ہے، اور اس لیے قلقشندی نے اہل انشاء کی عام علمی و عملی ضروریات کے اقتضاء کے لحاظ سے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ایک ایسا وسیع راستہ اختیار کیا، جس کی بدولت اس کی یہ تصنیف نہ صرف فن ادب کا ایک گرانمایہ تحفہ بنی بلکہ مختلف علوم و فنون کا بھی ایک دلآویز گلدستہ بن گئی ہے، یہ کتاب تاریخ و سیر بھی ہے، اور لغت و ادب بھی، تفسیر و حدیث بھی ہے، اور فقہ و افتاء بھی۔ عالم اسلام کا جغرافیہ بھی ہے، اور اسلام کی تمدنی ترقیوں کا حقیقی آئینہ بھی۔ فن انشاء کے اصول و قوانین، مختلف ممالک اسلامی، ان کے مختلف حالات و کیفیات اور عہد جاہلیت سے آٹھویں صدی ہجری

---

[1] القلقشندی تالیف ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ ص ۵۰۔

تک تمام ممالکِ اسلامی خصوصاً فارس، روم، مصر، مراکش، اندلس، ہندوستان، چین، اور یورپین و افریقی ممالک میں عربی زبان کی تدریجی نشر و اشاعت اور اس کی خصوصیات، دیوان انشاء کا قیام اور اسی مناسبت سے خلافت اسلامیہ کا تعارف، خلافت کے اصول و شرائط، خلفائے اسلام کے مفصل حالات، تمام عالم اسلامی میں ان کا نفوذ و اثر اور پھر اسی ضمن میں مشرق و مغرب کے تمام ممالکِ اسلامیہ کے جغرافی حدود، ان کی حکومتوں کا اجمالی تذکرہ اور خصوصاً مختلف ممالک کے تہذیب و تمدن، معاشرت اور عام طرز بود و ماند کے حالات نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔ یہ تو محض اجمالاً عرض کیا گیا، ورنہ صبح الاعشیٰ کے تمام فوائد و مشتملات کا استقصاء چند سطور میں ممکن نہیں ہے، شیخ محمد عبدالرسول نے کتاب کی آخری جلد کے آغاز میں ایک طویل اور وقیع مقدمہ سپرد قلم کیا ہے، اس کی ابتدائی سطور میں وہ رقمطراز ہیں۔

مھما اطال الکاتب فی وصف ھذا الکتاب وجود فکرہ واجھد قلمہ فی التعریف بہ وبقیمتہ العلمیۃ والادبیۃ فانہ لا یبلغ فیہ تعداد ما اودع فیہ من الفوائد وانطوی تحتہ من الدقائق

راقم سطور جتنی بھی زیادہ اس کتاب کی توصیف کرے اور اس کی تعریف میں جتنی بھی جودت فکر دکھائے اور جتنی بھی اس کی علمی و ادبی خوبیاں بیان کرنے کیلئے اپنے قلم کو حرکت دے اس کتاب کے فوائد اور دقائق کی کثرت کے مقابلہ میں اس تعریف و توصیف کی کوئی حیثیت نہ ہوگی،

اور پھر نقاد موصوف نے کئی صفحات میں صبح الاعشیٰ کے فوائد شمار کرانے کے بعد

بالآخر عاجز ہو کر یہ لکھنے پر اکتفا کیا کہ

لم یدع صغیرۃ ولا کبیرۃ — ہر چھوٹی بڑی چیز کا ذکر کر دیا ہے

الا ذکرھا۔ ولم یغادر — اور ہر غائب و موجود چیز کو اس میں

شاردۃ ولا واردۃ الا — شمار کرا دیا ہے۔

احصاھا۔[1]

قلقشندی نے ممالک اسلامیہ کے ذیل میں ہندوستان پر بھی توجہ کی ہے، اور اپنے عہد یعنی آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے جغرافیائی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی خط و خال کو مستند ماخذ سے استفادہ کرکے نمایاں کیا ہے، راقم آیندہ صفحات میں مناسب محل پر صبح الاعشیٰ کے آئینہ میں آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان کی ایک جھلک پیش کرے گا۔

قلقشندی سے پہلے انشا و کتابت کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی تھیں جن میں ابن فضل اللہ العمری کی "التعریف بالمصطلح الشریف" اور ابن ناظر الجیش کی تثقیف التعریف بہت مشہور اور نمایاں ہیں، ابن ناظر الجیش کی کتاب دراصل "التعریف" کا تتمہ و تکملہ ہے، قلقشندی کو ان دونوں کتابوں سے نہ صرف پوری واقفیت تھی بلکہ اس نے صبح الاعشیٰ کے مقدمہ میں نہایت شاندار الفاظ میں ان کو اپنے موضوع پر بے نظیر اور بہترین تالیف قرار دیا ہے، لیکن بایں ہمہ اس کا خیال تھا کہ ابھی تک انشا کے موضوع پر کوئی ایسی جامع تالیف نہیں لکھی گئی ہے، جس میں اس فن پر لکھی گئی تمام کتابوں کا استقصا کیا گیا ہو۔ اور جو تمام علوم و فنون کی جامع ہو، مزید برآں قلقشندی نے مذکورۂ بالا دونوں کتابوں کے بعض اہم نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ ان میں کچھ اہم مباحث مثلاً

[1] صبح الاعشیٰ ج ۱ ص ۱۵ و معارف ج ۲۶ عدد ۶۔

وصایا، اوصاف اور مراکز ڈاک وغیرہ کو ترک کر دیا گیا ہے، جن کی واقفیت ایک کاتب کے لیے نہایت ضروری ہے، چنانچہ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ کی تالیف میں نہ صرف ان نقائص کو دور کیا بلکہ انسان کا طائر خیال اس موضوع کے جن جن گوشوں تک پرواز کر سکتا تھا، ان سب کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے،

سبب تالیف — ذکر آچکا ہے کہ قلقشندی سنہ ۷۹۱ھ میں مصر کے شاہی دفتر انشا میں کاتب (سکریٹری) مقرر ہوا تھا، اسی زمانے میں اس نے دیوان انشا کے رئیس (چیف سکریٹری) قاضی بدر الدین بن فضل اللہ کی تقریظ میں الکواکب الدریۃ فی المناقب البدریۃ کے نام سے ایک مقالہ لکھا تھا، جس میں فن انشا کی تعریف، اس کی اہمیت و منزلت، طالب علم کے لیے اس کی شدید احتیاج اور اسی ضمن میں دوسرے بہت سے اصولی و فروعی امور پر بحث کی گئی ہے، لیکن غیر معمولی اختصار کے باعث اس مقالہ میں نہایت اغلاق و تعقید اور ابہام و اشاریت پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ قلقشندی نے اس کے اشارات اور مغلق عبارتوں کی شرح و وضاحت کی سخت ضرورت محسوس کرکے صبح الاعشیٰ کے نام سے چودہ ضخیم جلدوں پر مشتمل اپنی یہ شہرۂ آفاق کتاب تالیف کی۔ اس کام سے قلقشندی کو ۲۸ شوال سنہ ۸۱۴ھ بروز جمعہ فراغت ہوئی، ڈاکٹر عبد اللطیف حمزہ کا خیال ہے کہ علوم و معارف کی یہ انسائیکلوپیڈیا تقریباً بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد منصۂ شہود پر آئی ہے،

قلقشندی کا طریقہ تصنیف بھی بالکل منفرد اور جداگانہ ہے، اس نے معلومات کے بحر ذخار کو نہایت سلیقہ و حسن ترتیب اور کامیابی کے ساتھ ایک کوزہ میں بند کر دیا ہے، مولف کی انفرادیت کی زندہ مثال یہ ہے کہ پوری کتاب ایک مقدمہ، دس مقالات اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، لیکن پھر ہر مقالہ میں مختلف ابواب، ہر باب میں متعدد

فصلیں، ہر فصل میں کئی اطراف، پھر ہر طرف میں متعدد انواع، اور ہر نوع میں کئی کئی
مقصد پائے جاتے ہیں۔ اس طرح شاخ سے شاخ اور بات سے بات خود بخود نکلتی اور
پھیلتی چلی گئی، اور معارف و حقائق کا گنجینہ، بصائر و عبر کا خزینہ اور دولت گم گشتہ کا
دفینہ ہم تک پہونچ گیا۔

ماخذ کتاب صبح الاعشیٰ کو لعل شب چراغ بنانے کے لیے قلقشندی نے کتنی عرق ریزی،
دماغ سوزی اور محنت و جانکاہی سے کام لیا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان مآخذ و مصادر
کی طویل فہرست سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جن کے نام اور حوالے کتاب میں بار بار آئے ہیں،
کسی ماخذ سے اپنے کام کی چیز اخذ کرنے کے لیے جو دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے۔ اس سے موجودہ
زمانے کے محققین بھی بخوبی واقف ہیں، قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں سو سے زائد مصادر
سے استفادہ کیا ہے، جن کا حصر یہاں دشوار ہے، لیکن چند اہم اور مستند مآخذ کے نام
ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ المثل السائر لابن اثیر
۲۔ کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری
۳۔ التذکرہ لابی الفضل الصولی
۴۔ کتاب الام امام شافعی
۵۔ العلم والدواة محمد بن علی
۶۔ الملل والنحل للشہرستانی
۷۔ کتاب قوانین الدواوین ابن مماتی
۸۔ العقد الفرید لابن عبدربہ
۹۔ حیات الحیوان للدمیری
۱۰۔ ادب الکاتب ابن قتیبہ
۱۱۔ صناعة الکتابة ابوجعفر النحاس
۱۲۔ کنز الکتاب کشاجم
۱۳۔ البیان والتبیین جاحظ
۱۴۔ کتاب الاوائل لابی ہلال العسکری
۱۵۔ الاحکام السلطانیہ ماوردی
۱۶۔ تقویم البلدان یاقوت الرومی

۱۷۔ المسالک والممالک لابن فضل اللہ
۱۸۔ عجائب المخلوقات لابن اثیر
۱۹۔ فضائل العرب ابن ابی عبیدہ
۲۰۔ نزہۃ المشتاق ادریسی
۲۱۔ معالم الکتابة لابن شیث

ان کے علاوہ صبح الاعشیٰ میں علم جغرافیہ، تاریخ انساب اور ادب و انشاء کی
بہت سی ایسی کتابوں کے حوالے بھی ملتے ہیں، جن کے مصنفین کے نام قلقشندی نے
ذکر نہیں کئے ہیں، مثلاً الروض المعطار، مواد البیان، القانون، تاریخ
النیل کتاب الاطوال، رسم العمورہ، الدر الملتقط، الھناء الدائم
تاریخ صفد وغیرہ۔

مقدمۂ کتاب صبح الاعشیٰ کا مقدمہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں مولف نے
ان اصول و مبادی سے بحث کی ہے، جن کا پیش نظر رکھنا کتابت انشا کا پیشہ
اختیار کرنے سے قبل ضروری ہے،[1] اس میں قلقشندی نے کتابت کی قدر و منزلت،
ممتاز کاتبین کی توصیف، کتابت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، شاعری پر نثر کی
ترجیح، کاتبوں کے آداب و صفات، دیوان انشار کی حقیقت و تاریخ اور اس کے
قوانین پر متعدد فصلوں کے تحت بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے،
چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ عہدۂ کتابت (یعنی سرکاری سکریٹری کے فرائض منصبی)
دنیا میں خلافت و سلطنت کے بعد سب سے ارفع و افضل منصب ہے، اس کی
توصیف میں سلف کے بکثرت اقوال منقول ہیں۔ کتابت حکومت کی بنیاد،
مملکت کا ستون، ادب کا قطب، حکمت کی اصل، علم کا نور اور فضل و عدل کا
میدان ہے، دنیا کا کوئی بھی پیشہ ایسا نہیں ہے، جو کتابت اتنے فضائل و محاسن کا

[1] پورے مقالہ میں جہاں بھی کاتب اور کتابت کے الفاظ آئے ہیں ان سے اس زمانہ کا مروجہ مفہوم
مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں اس سے شاہی سکریٹری اور اس کا پیشہ دارانہ نوعیت کا کام مراد ہے۔

جامع ہو۔ ہر حکومت میں کاتب (یعنی سکریٹری) کو نہایت کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے، سلطنت کے نظم ونسق کو حکمراں اسی وقت بحسن وخوبی سنبھال سکتا ہے، جب اس کا کاتب لائق، باصلاحیت اور مدبر وبیدار مغز ہو۔ جو حکومت کی جانب سے ترغیب وترہیب وعدہ وعید اور امر ونہی کے احکامات مؤثر طور پر لکھکر وقتاً فوقتاً نافذ کر سکے۔

فن کتابت کی اہمیت اور علوے مرتبت کو مزید ذہن نشین کرتے ہوئے قلقشندی نے مورخین کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام عزیز مصر کے کاتب تھے، حضرت ہارون اور یوشع علیہما السلام دونوں حضرت سلیمانؑ کے ہاں کتابت کی خدمت انجام دیتے تھے، اسی طرح حضرت سلیمانؑ اپنے والد حضرت داؤدؑ کے کاتب تھے، اور آصف بن برخیا اور یوسف بن عنقا دونوں حضرت سلیمانؑ کے دربار میں کتابت کے منصب پر مامور تھے، اور حضرت یحیٰ علیہ السّلام حضرت عیسیٰؑ کے کاتب تھے۔ (۳۹/۱)

کتابت کی متعدد قسمیں اور بکثرت انواع ہیں، لیکن بقول قلقشندی بنیادی طور پر تمام اقسام صرف دو میں منحصر ہیں، کتابت انشا اور کتابت اموال، لیکن قدیم زمانے سے عرف عام میں کتابت کا لفظ علی الاطلاق فن انشا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اور کاتب کے لفظ سے عام طور پر اس فن کا ماہر اور واقف کار مراد ہوتا ہے، کاتب انشا کو کئی وجوہ سے کاتب اموال پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ اول الذکر علم وادب، تہذیب وثقافت اور عقل وذہانت کے جس مرتبۂ بلند کا حامل ہوتا ہے، اور جس طرح وہ اختراعِ معانی، جدتِ تعبیر اور تنوعِ فکر کے دلکش

مظاہر پیش کرتا ہے، کاتب اموال کو ان کمالات ومحاسن سے کوئی حصہ نہیں ملتا ہے، اور نہ اس کو اپنے پیشہ ورانہ کام کیلئے ان امور کی ضرورت ہی پڑتی ہے۔ (۵۳/۱)

شاعری پر نثر کی فوقیت

قلقشندی کے نزدیک نثر کو شاعری پر بوجوہ ترجیح حاصل ہے، اپنی اس رائے کی صحت کو اس نے "فی ترجیح النثر علی الشعر" کے عنوان سے ایک مستقل فصل میں مختلف مثالوں اور دلائل سے واضح کیا ہے، پہلے تو مؤلف نے شاعری کے بکثرت "فضائل جمہ" اور "مفاخر ضخمہ" شمار کرائے ہیں، لیکن پھر وہ لکھتا ہے کہ "اس کے باوجود نثر اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ مرتبت اور ارفع منزلت ہے، کیونکہ شعر وزن وقافیہ کے ساتھ مقید ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے قیود وشرائط کی پابندی شاعر کے لیے سد راہ ہوتی ہے، اس کے برخلاف نثر کیلئے اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، بلکہ اس میں الفاظ اپنے معانی کے تابع ہوتے ہیں، معنوی اعتبار سے شاعری میں کذب وغلط بیانی اور مبالغہ واغراق کی کثرت ہوتی ہے۔ اور نثر کا استعمال عموماً خطبات اور مراسلات جیسے بلند وپاکیزہ مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ (۶۰/۱)

کاتب کی صفات اور آداب کتابت

صبح الاعشیٰ کے مقدمہ کا تیسرا اور چوتھا باب خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اس میں مؤلف نے کاتب کی صفات، آداب کتابت اور دفتر انشا کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ کاتب یعنی سکریٹری کے لیے درج ذیل اوصاف سے متصف ہونا لازمی قرار دیتا ہے۔

(۱) اسلام، یعنی کاتب کا مسلمان ہونا ضروری ہے، (۲) صفت ذکورۃ یعنی کاتب ہمیشہ مرد ہی ہو سکتا ہے، عورت نہیں، اس کی تائید میں قلقشندی نے حضرت عمرؓ کا

یہ قول نقل کیا ہے، کہ "عورتوں کو کتابت کے پیشہ سے ہمیشہ دور رکھو" (۳) حریت
یعنی سکریٹری کا آزاد شخص ہونا شرط ہے، کیونکہ غلامی کا نقص وثوق و اعتماد کے مانع
ہے، (۴) تکلیف یعنی کسی معذور و اپاہج یا بچہ کو کاتب کے منصب پر مامور نہیں
کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں پر بھی اعتماد کلی نہیں کیا جاسکتا ہے، (۵) عدالت
کاتب کا منصف مزاج ہونا (۶) البلاغۃ (۷) وفور عقل (۸) احکام
شرعیہ اور فنون ادبیہ کی کماحقہ واقفیت کیونکہ جاہل حق و باطل کے درمیان
تمیز نہیں کرسکتا ہے۔ (۹) عالی ہمتی، شرافت نفس اور قوت ارادہ۔

مزید برآں کاتب کو حاضر جواب، زود حس، شیریں زبان، جرأت مند، امانت دار
پاک طینت، جامہ زیب، ریش دراز، ذہین و فطین، دراز قامت، فصیح و بلیغ
خوش رائحہ، اور با اخلاق ہونا ضروری ہے۔ (۱/۷۸) اسی سلسلہ میں قلقشندی
نے عباسی خلیفہ مامون کے مشہور کاتب اور فن انشا کے امام سہل بن ہارون کا
یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر دو شخص تقریر کریں، ان میں سے ایک نہایت خوش شکل،
شاندار اور لباس فاخرہ پہنے ہوئے، اور صاحب حسب و نسب ہو، دوسرا گمنام،
کم رو اور بدہیئت ہو تو عوام اول الذکر کی بات کو غور سے سنیں گے اور اس کو
اہمیت دیں گے، دوسرے کی طرف کوئی التفات کرنا پسند نہ کرے گا، بعینہٖ
یہی معاملہ کاتب کے ساتھ بھی ہے۔ (۱/۷۹)

قلقشندی نے آداب کتابت کے تحت اخلاص نیت، تقویٰ، ثواب آخرت،
خیر خواہی، رازداری، شکرگذاری، وفاداری، کمزور و ضعیف کی دادرسی وغیرہ
صفات کو کاتب کے لیے لازمی قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے، کہ حسن کردار اور حسن معاشرہ

دونوں کاتب کے لیے راس المال کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی سکریٹری
اپنے فرائضِ منصبی سے کبھی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ (۱/۸۰)

غرض قلقشندی نے اس اہم موضوع پر ممتاز اہل علم مثلاً ابن حاجب النعمان،
شہاب الدین الحلبی صاحب المثل السائر، ابو ہلال العسکری، ابن مماتی، اور صاحب
مواد البیان کے مستند اقوال و بیانات کی روشنی میں کاتب کے اخلاق و اطوار اور
کتابت کے آداب پر بہت مدلل بحث کی ہے۔ اسی سلسلہ میں مؤلف نے عبدالحمید بن
یحییٰ الکاتب کا وہ طویل مکتوب نقل کیا ہے جسے آدابِ کتابت کا سنگِ اساسی
یا اولین منشور قرار دیا جاسکتا ہے، صبح الاعشیٰ کے پانچ صفحات پر مشتمل یہ خط نہ صرف
معیاری عربی نثر کا ایک نادر نمونہ ہے بلکہ اُن تمام اخلاق حسنہ اور فضائل حمیدہ کا
گنجینہ بھی ہے، جن سے ہر کاتب کو ہر زمانہ میں متصف ہونا ضروری ہے، عبدالحمید نے
اس "وصیت نامہ" میں اس حقیقت کو متنوع الفاظ اور مختلف پیرایے میں بار بار واضح
کیا ہے کہ سکریٹری (کاتب) کو کبر و غرور سے نفور اور تواضع و انکسار کا پیکر ہونا چاہئے
مظلوموں کے ساتھ شفقت و عطوفت اور رعایا کے ساتھ ملائمت و نرمی اس کا عام شعار
ہونا چاہئے، اس کے کسی بھی قول و عمل سے جلالت منصبی کا اظہار نہ ہو، دراصل ہر کاتب حکمرانِ
وقت کا قائم مقام اور حکومت کا ترجمان ہوتا ہے، یہاں تک کہ بادشاہ اسی کے کانوں
سے سنتا ہے، اسی کی آنکھوں سے دیکھتا، اسی کی زبان سے بولتا، اور حد یہ ہے کہ اسی کے ہاتھوں
سے پکڑتا ہے، اسی وجہ سے سرکاری سکریٹری کو علمی اور اخلاقی تمام فضائل و کمالات
کا حامل اور ہر حیثیت سے ایک کامل انسان (Perfect man) ہونا نہایت ضروری
ہے، اگر اس کا کوئی پایہ بھی کمزور ہوگا تو اس کے نتیجہ میں سلطنت وہن و ضعف کا شکار

ہو جائے گی۔ (۸۹/۱)

دفتر انشا کی تاریخ

قدیم زمانے میں مکاتیب و مراسلات کے مستقل سرکاری دفاتر قائم تھے، جن کا عملہ مختلف قسم کے متعدد افراد پر مشتمل ہوتا تھا، ان دفاتر کو دیوانِ رسائل یا دیوانِ مکاتبات اور ان کے مہتمم کو "صاحب الدیوان" کہا جاتا تھا، پھر بعد میں جب اس دفتر کی ذمہ داریوں میں مزید وسعت پیدا کر دی گئی تو اس کو دیوانِ انشا سے تعبیر کیا جانے لگا، اور انشا و کتابت نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی۔

اسلام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے مراسلت کا آغاز ہوتا ہے، آپ ہی نے سب سے پہلے نجاشی، کسریٰ، ہرقل اور مقوقس وغیرہ بادشاہوں کو دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ بارگاہ نبویؐ میں تیس۳۰ سے زیادہ صحابہؓ کرام نے خدمتِ کتابت کی سعادت حاصل کی تھی۔ اسی طرح خلافت راشدہ میں ہر خلیفہ کے متعدد کاتب ہوتے تھے، پھر عہد اموی میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی کہ خلیفۂ وقت کسی منتخب روزگار، فاضل دوراں اور ماہر فن کو دفتر انشا کا کاتب متعین کرتا تھا، چنانچہ عربی زبان کا مشہور آفاق انشا پرداز عبدالحمید بن یحییٰ آخری اموی حکمراں مروان ابن محمد کا کاتب تھا، اور اس نے اپنی جودت طبع اور مہارت فن سے انشا و کتابت کو نہ صرف فنی عروج عطا کیا بلکہ پہلی مرتبہ اس کے اصول و قوانین بھی مرتب کئے۔

پھر جب عباسیوں کا آفتاب دولت طلوع ہوا تو منصب وزارت کے لئے کتابت و انشا کی مہارت لازمی شرط قرار دی گئی، چنانچہ اس عہد کے ماہر کاتبین ہی بتدریج ترقی کر کے وزارت کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اسی طرح عہد بنی عباس میں منصبِ کتابت کی ظاہری شان و شوکت اور قدر و منزلت میں غیر معمولی اضافہ

ہو گیا تھا، یہاں تک کہ فضل بن سہل کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مامون الرشید کے دربار میں ایک نہایت عمدہ زرنگار کرسی پر بیٹھکر جاتا تھا، جس کو خدام اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھتے تھے، صاحبِ مواد البیان نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں بساط حکومت کے تمام حاشیہ نشینوں میں کاتب کو حکمرانِ وقت سے سب سے زیادہ تقرب اور امتیاز خاص حاصل ہوتا تھا، بادشاہ اہم امور میں اس سے تبادلۂ خیالات اور اس کے مشوروں سے کسی حال میں بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا، قلقشندی نے اس اجمال کی نہایت شرح و بسط کے ساتھ وضاحت کی ہے، مستند حوالوں اور سلف کے قیمتی اقوال کے امتزاج نے ان تفصیلات کو بہت دلنشین اور موثر بنا دیا ہے، اس کے بعد وہ کاتب دیوان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ بارہ۱۲ امور اسکے اہم فرائض میں داخل ہیں، خطوط و شکایات پر دستخط کرنا، آنے والے خطوط کا غور و فکر کے بعد جواب دینا، خطوط کے کاغذ، القاب، افتتاحیہ اور اختتامیہ نیز دوسرے مندرجات پر خصوصی توجہ مبذول کرنا، دفتر سے مختلف خطوط و فرامین کے صادر ہونے سے پہلے ان کے لفظ لفظ کو بغور پڑھنا، دفتری امور کی کڑی نگرانی۔ ایسے امور عامہ پر توجہ جن سے بادشاہ اور حکومت کا کوئی فائدہ یا نقصان وابستہ ہو،

کاتب کو اپنے فرائض کے سلسلہ میں کس قسم کے مواد کی ضرورت پڑتی ہے

کاتب یا سکریٹری کو اپنے فرائض سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے کن علوم کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا علمی پایہ کیا ہونا چاہئے؟ اور عملی طور پر فن تحریر کے کن دقائق سے اس کی معرفت لازمی ہے؟ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں اس پر اتنی تفصیل و وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ تیسری جلد تک ساڑھے پانچ سو صفحات سے زائد میں یہ

دلچسپ اور معلومات آفریں بحث پھیلتی چلی گئی ہے، چنانچہ مولف نے کاتب کی لازمی
علمی صلاحیت کو درج ذیل انواع مین تقسیم کیا ہے۔

۱۔ لغت، نحو وصرف، علم معانی وبیان وبدیع، قرآن وحدیث، خطب
ورسائل اشعار وحکم،

۲۔ انساب عرب وعجم، ان دونوں کے اہم وقائع واخبار اور جنگیں، رسوم
ورواج اور عادات واطوار کی واقفیت،

۳۔ اقوام عالم کی تاریخ، خصوصاً تاریخ اسلام پر گہری نظر، پھر ہر اسلامی ملک
کے مستقل علیحدہ علیحدہ تاریخی حالات کا مطالعہ، اور اس میں بھی مصر کے ساتھ خصوصی
اعتنا، زمانۂ جاہلیت سے عہد ممالیک تک اس پر جو تاریخی انقلابات آئے اُن پر
سیر حاصل نظر۔

۴۔ جغرافیائی معلومات

۵۔ عجمی زبانوں مثلاً فارسی، یونانی، سریانی اور عبرانی وغیرہ کی معرفت،

۶۔ انسانوں وحیوانات کی مختلف جنسوں کی امتیازی خصوصیات اور انکے نقائص
وعیوب وغیرہ سے واقفیت، اس کو قلقشندی نے "فن الوصف" سے تعبیر کیا ہے۔ اور
اس سلسلہ میں کبوتر کے وصف پر پورا زور قلم صرف کیا ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ
یہ طائر نامہ بری کے لیے ضرب المثل ہے، اور اس حیثیت سے قلقشندی کے بنیادی
موضوع سے ایک خاص تعلق رکھتا ہے۔

ان علوم واوصاف کی واقفیت کے ساتھ کاتب کے لیے آلات سفر (مثلاً
خیمہ، مشعل وغیرہ)، آلات سواری (مثلاً لگام، زین، کوڑا اور کجاوہ)، آلات جنگ،

آلات حصار، آلات لہو ولعب، آلات عیش وطرب، قیمتی موتیوں اور مشہور خوشبوؤں
کے اوصاف وخصوصیات کی معرفت بھی ضروری ہے، (۱/۱۴۰)، قلقشندی نے مذکورہ
بالا علوم اور امور کی جو حیرت انگیز محققانہ تفصیلات صبح الاعشیٰ میں درج کی ہیں اگر
ان سب کا استقصا کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مثلاً انساب عرب کے
سلسلہ میں اس نے عرب بائدہ، عاربہ، مستعربہ اور بربر کے تعارف کے ساتھ بے شمار
قبائل اور انکی شاخوں کے نسب ناموں کا پچاس سے زیادہ صفحات میں انبار لگا دیا ہے
اس طرح انساب عجم پر بحث کرتے ہوئے ۲۶ عجمی اقوام کی اصل پر روشنی ڈالی ہے، ذیل
میں مولف کی دقت نظر، کثرت معلومات اور وسعت مطالعہ کا اندازہ کرنے کے لیے بطور
مشتے نمونہ از خروارے چند اہم مباحث کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

لغوی مہارت کاتب کے لیے غریب ونامانوس الفاظ سے واقف ہونا بھی بہت ضروری
ہے، بعض وقت اس کی ناواقفیت بڑی ذلت وندامت کا باعث ہوتی ہے، اس سلسلہ
میں قلقشندی نے ابن قتیبہ کے حوالے سے عہد عباسی کا ایک بہت دلچسپ اور عبرت آموز
واقعہ نقل کیا ہے کہ خلیفہ معتصم باللہ کے پاس کہیں سے ایک خط آیا، جس میں منجملہ اور
باتوں کے ایک جملہ یہ تحریر تھا "امطرنا مطراً کثر عنہ الکلاء" (یعنی اتنی بارش ہوئی کہ
اس سے ہری گھاس خوب اگی) سکریٹری یہ خط سناتے ہوئے جب اس جملہ پر پہونچا تو
اچانک خلیفہ نے دریافت کیا "یہ الکلاء کیا چیز ہوتی ہے" کاتب کو خود بھی معلوم نہیں تھا
وہ شدید تذبذب اور پریشانی میں مبتلا ہوگیا اور بالآخر لا ادری کہکر اپنی ناواقفیت
کا اظہار کر دیا، خلیفہ نے دفتر انشاء کے ایک دوسرے کاتب محمد بن عبدالملک الزیات
کو بلا کر اس لفظ کا مفہوم پوچھا، اس نے کہا "جب گھاس ہری اور شاداب ہوتی ہے،

تو اس کو کلأ کہتے ہیں، اور جب خشک ہو جاتی ہے تو اس پر حشیش کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے،
اس کے بعد پھر کاتب مذکور نے پودے کے اگنے سے لیکر نشو ونما مکمل ہونے تک کے مختلف
مراحل کے نام شمار کرانے شروع کر دیے۔ جس سے معتصم اتنا متاثر ہوا کہ فوراً زیات کو
اپنا وزیر بنالیا۔ (۱/۱۵۱)

لغت میں تبحر اور مہارت تامہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کاتب کو تمام مذکر ومؤنث
اسماء، متباین (جیسے سیاہی وسفیدی، طول وعرض) مترادف (جیسے درندہ کے لیے اسد اور
سبع) اور متضاد (جیسے امانت وخیانت، کشادگی وتنگی) الفاظ کا علم اور ان کے حقیقی ومجازی
معانی پر عبور حاصل ہونا چاہیے، (۱/۱۵۴) اسی طرح جن الفاظ کی متعدد لغات منقول
ہیں۔ ان کی واقفیت بھی ہونی چاہیے، مثلاً طل را کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ درست
ہے، نطع میں نون کے زیر اور زبر، طا کے سکون اور نون وطا، دونوں کے زیر کے ساتھ
چاروں لغتیں صحیح ہیں، بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن میں ۶۔۷ لغات منقول ہیں (۱/۱۵۹)

اسی طرح کاتب کے لیے فصیح اور عامی زبان سے واقفیت بھی لازمی ہے، فصیح
ایسے قبائل کی زبان کو کہتے ہیں، جن کا اہل عجم کے ساتھ اختلاط ومیل جول نہ ہو، مثلاً
قریش، ہذیل، کنانہ، تمیم، حجاز اور نجد وغیرہ اور عامی وہ زبان جس کو عامۃ الناس بولتے
ہوں، جیسے جفن کو جیم کے زیر اور قبول کو قاف کے پیش کے ساتھ بولنا غلط العام ہے،
(حالانکہ پہلا لفظ جیم اور دوسرا قاف کے زیر کے ساتھ صحیح ہے) قلقشندی نے اس فصل
میں بکثرت مثالوں کے ساتھ عرب کے مختلف لب ولہجہ پر بڑی طویل اور دلچسپ بحث
کی ہے۔ (۱/۱۶۱)

ایام عرب | زمانہ جاہلیت سے لے کر عہد اسلام تک عرب میں بکثرت مشہور لڑائیاں

ہوئیں۔ جن کی آگ عربوں کی فطرت اور جبلی امتیاز کے باعث سالہا سال تک سرد نہ
نہیں ہوتی تھی، ایک سرکاری سکریٹری کے لیے ان تمام لڑائیوں اور ان اشعار سے جن میں
ان ایام عرب کا ذکر اشارۃً یا صراحۃً مذکور ہوا ہے، پوری واقفیت ہونی چاہیے کیونکہ
بہت ممکن ہے کہ اس کو کوئی ایسا خط موصول ہو جس میں عرب کی کسی مشہور جنگ کا
حوالہ آیا ہو یا جنگ پر مشتمل اشعار سے استشہاد کیا گیا ہو، اگر کاتب ان وقائع اور ایام
سے ناواقف ہوگا، تو وہ اس خط کا شافی اور کافی جواب نہیں دے سکتا۔

قلقشندی نے ابو عبیدہ کی ایام العرب، ابن عبد ربہ کی العقد الفرید اور میدانی کی
کتاب الامثال سے استفادہ کرتے ہوئے عرب کی بکثرت لڑائیوں، ان کے اسباب وعلل
اور فتح وشکست پر روشنی ڈالی ہے، ان میں سے چند مشہور ترین جنگیں یہ ہیں۔

۱۔ **یوم خزار**۔ یہ عرب کی سب سے مشہور اور بھیانک ترین جنگ شمار ہوتی ہے،
خُزار مکہ اور بصرہ کے درمیان ایک پہاڑ کا نام ہے، یہ جنگ بنو ربیعۃ الفرس اور قبائل
یمن کے درمیان واقع ہوئی تھی جس میں بنو ربیعہ نے غلبہ حاصل کرکے قبائل یمن میں
خوفناک قتل عام کیا تھا،

۲۔ **یوم عین اُباغ**، اس جگہ غسان اور لخم کے درمیان جنگ ہوئی تھی جس میں
لخم کو شکست ہوئی، اور اس کا سپہ سالار منذر بن ماء السماء قتل ہوا تھا،

۳۔ **یوم الکلاب الاول**، کلاب بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک جگہ ہے،
اس جنگ کا آغاز شراحیل اور سلمہ نامی دو حقیقی بھائیوں کی لڑائی سے ہوا تھا،
لیکن پھر ان دونوں کے جانبدار ہو کر دوسرے قبائل بھی جنگ کی آگ میں کود
پڑے، اس لڑائی میں، سلمہ اور اس کے حامیوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

۴۔ یوم ذی قار، عہد جاہلی کی یہ مشہور جنگ ولادت نبویؐ کے چالیسویں سال شاہ کسریٰ اور بکر بن وائل کے درمیان واقع ہوئی تھی، دراصل کسریٰ نے شاہ حیرہ نعمان بن منذر سے کسی بات پر ناراض ہو کر اس کو قید میں ڈال دیا تھا، جہاں اس کی وفات ہوگئی یہی بنیادی سبب آگے چل کر جنگ کا باعث ہوا، اور اس میں عجمی افواج کو اپنی کثرت اور تیاری کے باوجود شرمناک شکست اٹھانی پڑی تھی، ان لڑائیوں کے علاوہ قلقشندی نے عہد اسلام کی لڑائیوں میں جمل، صفین اور مرج راہط کی جنگوں پر بھی اجمالاً روشنی ڈالی ہے، کیونکہ اسلامی تاریخ کی تمام کتابیں ان لڑائیوں کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں، (۱/۳۹۴)

عربوں کے رسوم اور عادات

جاہلی عرب میں بہت کثرت سے عجیب وغریب رسموں اور معتقدات کا رواج تھا، جب اسلام کا آفتاب عالمتاب طلوع ہوا تو یہ تمام رسوم وعادات یکسر ممنوع قرار پا گئیں۔ قلقشندی نے عہد جاہلی کے ان خرافات کو "اوابد العرب" کے لفظ سے تعبیر اور اس کے ۳۳ سے زیادہ اقسام ذکر کیے ہیں جن میں سے کچھ نمایاں یہ ہیں، کہانت، نجوم، قمار، فال، شگون انصاب اور ازلام (یہ بھی شگون کی ایک قسم ہے جو تیر کے ذریعہ لیا جاتا ہے)

اسی طرح عربوں کی قدیم عادات میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام بھی شامل تھے، پہلے کی شکل یہ تھی کہ جب کوئی اونٹنی پانچ مادہ بچے جنتی تو عرب اس کے پانچویں بچے کا کان چیر کر چھوڑ دیتے تھے، اور ایسا برابر اسوقت تک کیا جاتا رہتا جب تک اس اونٹنی کے نر بچہ پیدا نہ ہو جاتا۔ اس کان کٹی مادہ کا دودھ صرف مرد استعمال کر سکتے تھے عورتیں نہیں۔

سائبہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے جانور یا غلام کو آزاد کر دیتا تو وہ ہمیشہ

کے لیے حرام ہو جاتا تھا۔ اور وصیلہ یہ تھا کہ جب کوئی بکری سات بچے دیتی اور ساتواں نر ہوتا تو اس کو ذبح کر ڈالتے تھے، اگر آخری بچہ مادہ ہوتا تو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیتے تھے، حام کے رواج کی شکل یہ تھی کہ جس نر اونٹ کے دس بچے ہو جاتے اس کو آزاد چھوڑ دیتے تھے، جہاں چاہے، چرے، اور اس پر سواری نہیں کی جاتی تھی، اور نہ اس کے بال کترتے تھے، قرآن کریم نے جہاں جاہلی عربوں کے بہت سے خرافات ورسوم پر ضرب کاری لگائی ہے، وہاں مذکورہ بالا چاروں رواج کو بھی یکسر بے اصل وبنیاد قرار دیا ہے۔ (ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام)

اسی طرح عربوں کے بعض مضحکہ خیز معتقدات اور عادات یہ تھے، لڑکیوں کو عار کے خوف سے زندہ درگور کر دینا۔ لڑکیوں کو فقر ومحتاجی کے اندیشہ سے مار ڈالنا کسی بچہ پر نظر لگ جانے کا اندیشہ ہو تو اس کو لومڑی اور بلی کے دانت کا تعویذ پہنانا مصائب وآلام کے وقت چادر پھاڑنا، حسد اور جادو سے محفوظ رہنے کے لیے خرگوش کی ہڈی کا تعویذ پہننا کسی وبائی علاقے کے حدود میں داخل ہونے سے پہلے کھڑے ہو کر گدھے کی طرح رینگنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ کہ اب اس وبا کا اثر نہیں ہوگا۔

اسی طرح مختلف مواقع پر آگ روشن کرنے کی رسم بھی عربوں میں رائج تھی، مثلاً اگر وہ کسی شخص کا اپنے پاس دوبارہ آنا پسند نہ کرتے تھے، تو اس کے روانگی کے لیے، پیٹھ پھیرتے ہی، آگ روشن کرتے۔ شکار میں ہرن کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لیے بھی آگ جلاتے تھے، اسی سلسلہ میں قلقشندی نے نار القریٰ

کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے عربوں کی مشہور زمانہ مہمان نوازی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، اس آگ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ بھولا بھٹکا راہ گیر گھر کے سامنے آگ روشن دیکھ کر ادھر آجائے، اور اس عرب کو اس کی مہمان نوازی کی سعادت حاصل ہو جائے، ظاہر ہے عربوں کے مذکورۂ بالا تمام رسوم و رواج میں تنہا یہی ایک عادت بس ہے، جس کو لائق صد تحسین قرار دیا جا سکتا ہے،

(باقی)

تحفۃ الحبیب

تالیف

فخری بن امیری ہروی

از

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلطان محمد فخری بن امیری دسویں صدی ہجری کا ایک اہم مصنف اور شاعر گذرا ہے، چنانچہ اس کی متعدد تصانیف کا پتہ چل گیا ہے، جن میں سے تین چار شائع بھی ہو چکی ہیں، روضۃ السلاطین لطائف نامۂ فخری اور جواہر العجائب مکمل طور پر اور دیوان کا خلاصہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے، مگر قبل اس کے کہ فخری کی زندگی اور تالیفات وغیرہ کا مختصر خاکہ پیش کیا جائے، ان سطور کے لکھے جانے کے محرک کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا،

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم نے اپریل سنہ ۱۹۷۴ء میں مجھے ایک خط بھیجا، اس کے ہمراہ مولوی محمد مبین نقوی کا ایک خط، اور اس کے ساتھ اُن کی ایک یادداشت بھی جو تحفۃ الحبیب کے اُن کے ذاتی نسخے پر مبنی تھی، مولوی صاحب مرحوم کی یہ یادداشت آج سے ۴۴ سال قبل مرتب ہوئی تھی، اور اس درمیان میں تحفۃ الحبیب اور اس کے مؤلف فخری کے متعلق خاصی تحقیق ہو چکی ہے، اس بنا پر مولوی محمد مبین کی تحریر میں خامیاں نظر آتی ہیں،

لیکن دو باتوں کی وجہ سے میں نے اُن کی یہ یادداشت من وعن شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اوّل یہ کہ اس تحریر کے ذریعہ "تحفۃ الحبیب" کے ایک نئے نسخہ کا سراغ ملتا ہے، (اگرچہ اس وقت معلوم نہیں کہ وہ نسخہ کہاں ہے، باقی بھی ہے یا نہیں،) دوسرے یہ کہ اس یادداشت کے ہمراہ تحفۃ الحبیب کے تمام شعرا، (۲۳۶) کی مکمل فہرست ہے، چونکہ یہ فہرست اب تک شائع نہیں ہوئی ہے، اس لئے اس کی اشاعت خاصی مفید ہوگی،

فخری بن امیری کی روضۃ السلاطین کے مقدمے میں سید حسام الدین راشدی نے اس مصنف کی زندگی اور تالیفات کے بارے میں بڑی تفصیل سے[1] بحث کی ہے اور اسکے بارے میں قرار واقعی تحقیقات کر ڈالی ہیں اس لئے میرے لئے اس سے زیادہ بہتر اور کوئی بات نہ ہوگی، کہ میں اس کا خلاصہ پیش کر دوں ویسے فخری کی روضۃ السلاطین پر جو مضمون اختر میاں جوناگڈھی نے "ارمغانِ علمی"[2] میں شائع کیا تھا اس میں فخری کی حیات اور کارنامے پر مفصل بحث شامل ہے، گو بقول راشدی وہ ہر طرح کے سقم سے پاک نہیں،

فخری کا نام سلطان محمد تھا، اور وہ ہرات کا باشندہ تھا، اس کا باپ امیری اپنے دور کا نامور فاضل اور شاعر تھا، چنانچہ فخری نے تحفۃ الحبیب اور تقی اوحدی نے عرفات العاشقین[3] میں اس کے کافی اشعار نقل کئے ہیں، فخری کی پیدائش سنہ ۹۰۳ھ[4] میں قیاس کی گئی ہے، وہ

[1] حرفِ آغاز، تذکرۂ روضۃ السلاطین وجواہر العجائب، سندھی، ادبی بورڈ، حیدرآباد (۱۹۶۸) ص ا—ت،

[2] پروفیسر محمد شفیع مرحوم کے لئے یہ کتاب ڈاکٹر سید عبد اللہ نے مرتب کر کے پیش کی، طبع لاہور

[3] دیکھئے عرفات عاشقین نسخہ بانکی پور، پٹنہ ذیل مولانا امیری خراسانی در روضۃ السلاطین؛

مقدمہ ص ۱۴،

[4] دیکھئے روضۃ السلاطین (مقدمہ) ص ۱۷،

ایک مدت تک اپنے وطن ہرات میں رہا، اور وہاں بعض امرا، اور بادشاہوں کی مدح کی، اور بعض کے نام کتابیں تالیف کیں جن میں شاہ اسمٰعیل صفوی (م: ۹۳۰) امیر درمیش خاں[1] والیِ ہرات (م: ۹۳۱) شاہزادہ سام میرزا[2] (۹۲۳-۹۷۵) میرزا کمال الدین[3] شاہ حسین اصفہانی وزیر شاہ اسماعیل (م: ۹۲۵) اور خواجہ حبیب اللہ[4] ساوجی (م: ۹۳۶) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

ایسا خیال ہوتا ہے کہ خواجہ حبیب اللہ کی حیات تک فخری ہرات میں مقیم رہا ہے، اس کے بعد اُس نے سندھ کا رُخ کیا ہے، یہاں وہ شاہ ارغون (م: ۹۲۸) کے بیٹے شاہ حسن ارغون (۹۲۸-۹۶۲) کے دور فرمانروائی میں پہنچا، راشدی صاحب کی تحقیق کے مطابق فخری ۹۴۷ھ سے[5] قبل سندھ آگیا تھا، شاہ حسن کے نام فخری نے دو کتابیں لکھیں یعنی روضۃ السلاطین[6] اور صنائع الحسن، شاہ حسن کی وفات کے بعد وہ عیسیٰ خان ترخان (۹۶۲-۹۷۳) کے دربار سے وابستہ ہوا، اس کی مشہور تالیف جواہر العجائب شاہ حسن کی بیوہ حاجی ماہ بیگم کے نام پر ہے،

سندھ سے فخری اکبرآباد آگیا، اور ماہم انکہ[7] بیگم سے وابستگی پیدا کی، اس کے نام جواہر العجائب کا دوسرا اڈیشن معنون کیا، اُس نے سلیمہ سلطان[8] بیگم حرم اکبر بادشاہ کی بھی مداحی کی ہے، تقی اوحدی کے بقول فخری سنہ ۹۷۰ھ تک ہندوستان میں رہا ہے، اُسے حج کی بھی

[1] شہزادہ سام میرزا کی طرف سے ۹۲۷ھ میں ہرات کا نائب مقرر ہوا تھا، اس کے حالات کے لئے دیکھئے عالم آرائے عباسی [2] شاہ اسماعیل صفوی کا بیٹا اور خراسان کا حاکم تھا، وہ فارسی کے مشہور تذکرہ تحفۂ سامی کا مؤلف بھی ہے، [3] وہ شاہ اسماعیل صفوی کا وزیر تھا، جو ۹۲۹ھ میں مقتول ہوا، دیکھئے عالم آرائے عباسی، [4] شاہ اسماعیل کے زمانے میں خراسان کا وزیر تھا، نہایت علم دوست اور ادب پرور شخصیت کا مالک تھا، دیکھئے روضۃ السلاطین (مقدمہ - حاشیہ ص ۲۰-) [5] ایضاً ص ۲۷

(بقیہ حاشیہ ص آیندہ پر)

سعادت نصیب ہوئی تھی، مگر یہ معلوم نہیں کہ اس نے یہ فرض کس تاریخ میں ادا کیا،

فخری کی حسب ذیل تالیفات قابلِ ذکر ہیں،

(۱) ہفت کشور، اس کتاب کا موضوع تاریخ ہے، لیکن اس پر افسانوی رنگ غالب ہے، یہ کتاب شاہ اسماعیل صفوی کے نام پر لکھی گئی، اس کے نسخے تاشکند اور مدینہ منورہ میں ملتے ہیں (دیکھئے ریو)، سپہ سالار کے یہاں بھی اس کے مخطوطے محفوظ ہیں، بظاہر ۹۲۷ھ سے قبل کی تالیف اور فخری کی ابتداے جوانی کی مشق ہے۔

(۲) لطائف نامۂ فخری، میر علی شیر نوائی نے مجالس النفائس نام کا ایک تذکرۃ الشعرا ترکی میں لکھا تھا اس کا متعدد فاضلوں نے فارسی میں ترجمہ کیا، ان میں ایک فخری کا لطائف نامہ ہے، لیکن اس مترجم نے اس میں قابلِ قدر اضافے بھی کئے ہیں، برٹش میوزیم میں اس کا ایک قیمتی نسخہ موجود ہے، جس کی بنا پر ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اورنٹیل کالج میگزین میں (اگست ۱۹۳۱ء تا فروری ۱۹۳۳ء) چھاپ دیا ہے، اس کے متعدد نسخے ملتے ہیں،

(۳) تحفۃ الحبیب جس کے بارے میں ہم خصوصیت سے گفتگو کر رہے ہیں، ایک بیاض ہے، جس میں ہم طرح اور ہم ردیف غزلیں جمع کی ہیں۔ اور ایک طرح در دیف میں کم از کم چار غزلیں ضرور اکٹھا کر دی گئی ہیں، تحفۃ الحبیب خواجہ حبیب اللہ ساؤجی کے نام پر لکھی گئی، قرین قیاس ہے کہ یہ مجموعہ لطائف نامہ سے تقریباً ایک سال بعد ۹۲۹ھ میں مرتب ہوا، گلچین معانی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۹) ۵۶ اکبر کی دایہ جیجی بیگم ماہم انگہ بڑی شخصیت کی مالک تھی، اس کے ذکر سے اس دور کی تاریخیں پر ہیں، ۵۸ سلیمہ سلطان بیگم بابر بادشاہ کی نواسی ہوتی تھی، اکبر کے حکم سے اس کا نکاح بیرم خاں سے ہوا، اور آخر الذکر کے قتل کے بعد وہ خود اکبر کے عقد میں آگئی، اس کی وفات ۱۰۲۱ھ میں ہوئی، اس کے حالات اکبر نامہ منتخب التواریخ اقبال نامۂ جہانگیری وغیرہ میں ملتے ہیں،

نے اپنے نسخہ کی بنیاد پر لکھا ہے، کہ اس میں ۲۳۹ شعرا کا کلام شامل ہے، لیکن مولوی محمد مبین مرحوم کے نسخے میں اُن کی تعداد ۲۳۶ تھی، اس بیاض کے متعدد نسخے ملتے ہیں، دو خدا بخش خاں کے کتابخانہ بانکی پور پٹنہ میں ہیں، یہ ضخیم بیاض نہایت اہم ہے، لیکن ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے،

(۴) تذکرۃ روضۃ السلاطین حسب ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے،

۱- وجہ تسمیہ شعر و احوال بہرام گور، و ابتداے نظم فارسی،

۲- در بیان احوال پادشاہان چغتائی، اوزبک و سلاطین اثیاں،

۳- در بیان احوال پادشاہان چغتائی از اولاد و امجاد امیر تیمور،

۴- در بیان احوال پادشاہان عراق و روم،

۵- در بیان احوال بعضے از ملوک ہندوستان و دیگر اطراف

۶- در بیان احوال امرا،

۷- در ذکر جمیل حضرت نواب (شاہ حسن ارغون)

یہ کتاب شاہ حسن ارغون (م: ۹۶۲) کے نام پر مرتب ہوئی، سال ترتیب ۹۵۸ھ کے قریب ہوگی، یہ کتاب زیادہ ضخیم نہیں، لیکن نہایت مفید ہے، اس لئے کہ اس میں اکثر ایسے واقعات مذکور ہیں، جو کسی اور ذریعے سے نہیں ملتے، سید حسام الدین راشدی صاحب کے اعتنا سے سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۸ء میں اس کا ایک انتقادی متن مع ایک عالمانہ و محققانہ مقدمے و حواشی کے شائع کیا ہے،

(۵) صنائع الحسن، فارسی علم بدیع پر یہ کتاب شاہ حسن مذکور کے نام پر ۹۵۸ھ کے بعد مرتب ہوئی، اس کے محدود نسخے ملتے ہیں، دو نسخے آکسفورڈ اور ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم کے پاس ایک نسخہ تھا، جس پر انھوں نے ایک مضمون

بھی شائع کیا تھا،

(۶) جواہر العجائب ۹۶۳ھ کی تالیف ہے اور فخری کی سب سے مقبول کتاب ہے، اس کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے، کہ کئی بار یہ طبع ہو چکی ہے، دو بار نولکشور نے چھاپی ہے، ایک بار سید شمس اللہ قادری کی ترتیب سے رسالہ اُردو میں طبع ہوئی ہے، آخری بار راشدی صاحب نے روضۃ السلاطین کے ساتھ ایک ہی جلد میں ۱۹۶۸ء میں اس کا انتقادی متن مع مفید تعلیقات کے شائع کیا ہے،

جواہر العجائب شاعرہ عورتوں کا مختصر سا تذکرہ ہے جو موضوع کی مناسبت کی بنا پر شاہ حسن ارغون کی بیوہ حاجی ماہ بیگم کے نام جو بعد میں عیسٰی خاں ترخان کی زوجیت میں آئی، معنون ہوا، لیکن فخری جب ہندوستان پہنچا تو اس نے پہلا دیباچہ بدل کر حضرت ماہم بیگم کے نام معنون کی اور آخر میں اس کی مدح میں ایک نیا قصیدہ بھی شامل کیا،

اگرچہ یہ تذکرہ مختصر ہے لیکن اُس کی معلومات نہایت گرانقدر ہیں، در اصل فارسی گو شاعرات کا یہ سب سے قدیم تذکرہ ہے،

(۷) دیوان فخری کہنہ مشق شاعر تھا، چنانچہ اس کا دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا، دیوان کا ایک نسخہ تقی اوحدی نے آگرے میں دیکھا تھا، مگر اب وہ ناپید ہے، سید حسام الدین راشدی نے تحفۃ الحبیب اور محک مرتضائی کی رو سے فخری کی ۱۰۱ غزلیں جمع کر دی ہیں، جو روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب کے ساتھ اسی مجموعہ میں شامل ہیں،

فخری کی طرف ایک اور بیاض بستان خیال منسوب ہے، میر الٰہی ہمدانی نے گنج الٰہی میں اور بعد کے مؤلفین و محققین نے اپنی تحریروں میں اسے فخری ہی کی تالیف قرار دیا ہے، مگر راشدی صاحب نے بستان خیال کو کمباش تلی ابدال رومی کی تالیف بتایا ہے،

اب میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم کا خط جو میرے نام ہے، اور پھر مولوی محمد مبین نقوی صاحب کا خط جو پروفیسر رضوی کے نام ہے، مع فہرست شعرائے تحفۃ الحبیب کے شائع کر رہا ہوں، اور جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں انہیں صاحب کی تحریر بطور یادگار کے شائع کی جا رہی ہے، لیکن اُن کی مرتبہ شعراء کی فہرست اہمیت کی حامل ہے،

ادبستان، دین دیال روڈ۔ لکھنؤ۔ ۳

۲ر اپریل ۷۴ء

عزیز محتشم زاد اللہ شرفکم

اخبار ہماری زبان مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۹۷۴ء سے یہ خوش خبری ملی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ۱۵ر مارچ کو آپ مجلس کے ممبر منتخب کئے گئے، مبارک باشد

۲۳۶ شعرائے فارسی کی ہم طرح غزلوں کا ایک قلمی مجموعہ موسوم بہ تحفۃ الحبیب مولوی محمد مبین نقوی الٰہ آبادی مرحوم کے پاس تھا، انھوں نے اس نایاب مخطوطہ کی کیفیت اور فہرست مندرجات بڑی تفصیل سے لکھ کر مجھ کو بھیجی تھی، یہ آج سے بیالیس سال پہلے کی بات ہے، مولوی صاحب مرحوم نے اس بارے میں جو خط مجھ کو لکھا تھا، وہ میں آپ کو اس خیال سے بھیج رہا ہوں کہ شاید ادبیات فارسی کی تحقیق کے سلسلے میں آپ اس سے کچھ کام لے سکیں

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے، والسلام

خیر اندیش

سید مسعود حسن رضوی

فضیلت مآب زادت الطافکم :- تسلیم، اس معاملے میں قابل عمل مشورہ دیجئے،
میرے پاس ایک نایاب قلمی مجموعہ شعرائے فارسی کی ہم طرح (یعنی ہم قافیہ و ردیف و بحر)

غزلوں کا ہے، جو ملا فخری ابن محمد امیری نے جمع کیا تھا، اور اسے دستور عالی نژاد حبیب اللہ آصف کے حکم سے اس کے جمع کرنے کا خیال ہوا تھا، جیسا وہ کہتا ہے:۔

مثنوی:۔

بحمد اللہ ایں دولتم دست داد — بالطاف دستور عالی نژاد
معین شہنشاہ ترک و عرب — حبیبُ اللّٰہش نام و آصف لقب

اور جمع کرنے کے بعد دستور معظم کی نظر سے ابھی گزرا نا تھا، جیسا کہ ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے:

شنا بندہ مامور فرماں شدم — بدان بزم عالی شتاباں شدم
چو ہمرہ مرا بخت و اقبال بود — رہم داد درباں و احساں نمود
یکے بزم دیدم چو خلد بریں — در آں بزم سیمیں براں حور عین
نشستہ سلیماں صفت آصفے — بہر سو پری پیکرانش صفے
مرا دید و خواند از کرم سوی خویش — نوازش کناں گفت پیش آے پیش
بیا ہنگم تا چہ آوردۂ — چہ کار از کمال و ہنر کردۂ
خرد چوں از و بر من ایں لطف دید — سلیمان و مورش بخاطر رسید
چو پیش آمدم از مقام قرار — برا فلاک سودم سر افتخار
ز روے سخن پردہ بر داشتم — ز دانش بہ پیش نظر داشتم
تمامش ز آغاز و انجام دید — ز راہ تامل بغورش رسید
خرد پیشہ دستور با عدل و داد — زبان مبارک بتحسیں کشاد
چنیں گفت دستور دانا گہر — (دوسرا مصرع جلد بند نے کاٹ ڈالا؟ مگر یہ ظلم اور کہیں نہیں کیا ہے)

ز ہر گلشنے گلبنے خواستی — نکو بوستانے بیاراستی

اس مجموعے کا نام نہایت خوشخط (یعنی نستعلیق) لکھوا کے ممدوح کے نام کی مناسبت سے تحفۃ الحبیب جامع نے رکھا تھا، میں نے اسے اپنا خون بہا کے حاصل کیا، اور بعد کلام اللہ کے سب سے زیادہ اس ایک تحفہ نایاب سے فائدہ اٹھایا، اب مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اور چاہتا ہوں کہ یورپ کے کسی قدرداں کے ہاتھ فروخت کردوں، بشرطے کہ قیمت معقول ملے، اس کی امید نہیں، کہ اس انمول تحفے کی قیمت ہندوستان میں کوئی حسب دل خواہ دیلیکے، حالت اور کیفیت اس کی یہ ہے:۔

حجم ہزار صفحوں سے زیادہ ہے، فولس کیپ کاغذ سے بڑی تقطیع ہے، دو سو چھتیس شعرائے معروف کا کلام یعنی پوری پوری غزلیں ہیں، مگر غیر معروف شعراء کا کلام بھی کچھ کم نہیں، [1] علاوہ دواوین کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے، خط ایرانی ہے مگر نہایت واضح اور جلی، جس روشنائی سے کتابت ہوئی ہے، وہ بھی اب معدوم ہے، شروع اور اخیر کا ایک ایک صفحہ میں نے رو رو کے نکال دیا، کیونکہ جاہلوں کی قدر ناشناسی سے وہ دونوں بیکار ہو گئے تھے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن شعراء کا کلام لیا گیا ہے، اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا نام تو تذکروں میں ہے، مگر پوری غزلیں سوا اس مجموعے کے اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتیں، علی الخصوص بادشاہوں کا تبرک بہت ہے، شاہزادوں کا کیا ذکر ہے، یہ تحفۂ نایاب شاہ جہانگیر کے زمانے کے بعد جمع کیا گیا ہے، کیونکہ جہانگیر کی کئی غزلیں اس میں لی گئی ہیں، مگر ہندوستان کا نہ تو کاتب ہے، نہ جامع، فیضی فیاضی کی کوئی غزل اس میں نہیں، اس سے مرزا غالب کا وہ قول صحیح سمجھا جا سکتا ہے، کہ فیضی کی اکثر جگہ ہنسی اڑائی ہے۔

[1] واضح ہو کہ یہ قیاس سرا سر غلط ہے، "نذیر"

نکل جاتی ہے۔ "بہت سے ایسے الفاظ کی سند ملتی ہے جنھیں ہندوستانی لغت لکھنے والے اپنی تنگ نظری سے غلط سمجھتے ہیں، بہتیرے ایسے محاورات ملتے ہیں، جن کے غلط معنی ہندوستانیوں نے لکھے ہیں، وہ الفاظ بھی ہیں جن کے متعلق جاہلوں نے فضول بحثیں کی ہیں، مولانا آزاد کی رائے کی تائید کہیں ہوتی ہے، کہیں نہیں ہوتی، حالی کی حماقتیں اور صہبائی کی زبردستیاں اس سے ثابت کرنے والا خوب خوب ثابت کر سکتا ہے، شعرائے ایران کا باہمی موازنہ جیسا اس مجموعے کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے، اور کسی کتاب سے ممکن نہیں، کوئی شاعر اس میں ایسا مذکور نہیں جو مستند نہو، کوئی کلام ایسا نہیں لیا گیا جس میں عیب ہو، غالباً جامع وہی فخری ہے جس کی تاریخ فخری ہے، مجکو تلاش سے اب تک فخری کا کوئی نسخہ نہیں ملا، ورنہ معلوم ہوجاتا کہ یہ کون فخری ہے، مگر یہ محقق ہے، کہ ایران کا معتبر شاعر ہے، بہتیرے غلط نسخے اس مجموعے سے صحیح کئے جا سکتے ہیں، اگرچہ یہ خوش نویس بھی غلط نویسی کے الزام سے نہیں بچ سکتا، یہ مجموعہ ایک جگہ رہن تھا، راہن کے لاوارث مرنے پر مرتہن نے میرے ہاتھ بیچ ڈالا، اب میں نے اس کے واسطے کیا دیا ہے، اس کا جواب ذرا مشکل ہے، کیونکہ جو کچھ دیا ہے، وہ اتنا ہے کہ مرتے مرتے بھی نہ دیتا، مگر ایسی کتاب پر جان تو کیا ہے ایمان تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہیں کسی حالت میں اسے مکان سے دور لے جانے پر انشاء اللہ تعالیٰ آمادہ نہونگا، زوجہ کے زیوروں کے صندوق میں مقفل رکھتا ہوں، صرف مولوی جلال الدین صاحب کو اس کی زیارت کرادی ہے، ہاں اگر کوئی صاحب میرے مکان پر دیکھنا چاہیں گے تو ضرور دکھا دوں گا، مگر اس شرط پر کہ اس کتاب سے ایک لفظ بھی نقل نہ کریں،

ایک دیوان حافظ قلمی بھی دنیا سے نرالا میرے پاس ہے، وہ بھی فروخت کرونگا اس کا حال یہ ہے کہ حافظ کے جو قصائد معدوم سمجھے جاتے ہیں، وہ سب اس میں موجود ہیں، اصلی

ثابت کر دینا میرا کام ہے، جو غزلیں حقیقۃً الحاقی ہیں، اُن کا پتہ اس سے بخوبی چلتا ہے، ایک شرح لمعہ[1] بھی ہے، یہ وہ نسخہ ہے جو اب سوا میرے دنیا میں کسی کے پاس نہیں، چودہ علماء عراق کے پاس یہ نسخہ وقتاً فوقتاً رہن کیا گیا، ان سب کی مہریں اور رہن کی تاریخیں اس میں موجود ہیں، اس نسخے کو میں نے لکھوا لیا ہے، اب اصل کی ضرورت نہیں، مگر علماء و مجتہدین کا تبرک ہے اور بقول مولانا امجد حسین، مرحوم کے نایاب ہے، اسلئے یہ بھی سونے میں تلے گا، تو جدا کرونگا ورنہ جان کے ساتھ، تحفۃ الحبیب کے شعراء کی فہرست منسلک ہو رائے قائم کرکے مشورہ مفید سے شرفیاب فرمائیں، یہ عرض اس خیال سے کی گئی ہے، کہ جوہر را جوہری می شناسد، فقیر حقیر محمد مبین نقوی،

محلہ چاک شہر الہ آباد، ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۲ء،

عرض ثانی یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب یہ کتابیں میرے مکان پر دیکھنا چاہیں اور اس دیکھنے سے یہ غرض ہو کہ وہ مجھ سے معاملہ کریں تو یہ تحریر اُن کو عنایت کر دیجئے گا جتنا لکھا ہے اُس کا ایک ایک لفظ بلکہ نقطہ خواہ وہ اوپر ہو یا نیچے صحیح ثابت کر دوں گا، مگر خواہ مخواہ میرا وقت ضائع نہ کیا جائے، "مبین"

الف ممدودہ	آبی، آذری، آصفی، آگہی، آہی،
الف مقصورہ	ابن حسام۔ ابن یمین، ابوالخیر، ابونصر نہنہ، احمد، اسعدی، کمال اسمٰعیل، اسیری، میرزا اصغر مشہدی۔ اصیلی۔ افسری۔ خواجہ افضل، امیر حسن علی جلائر۔ امیر محمود برلاس امیری۔ امیر سلطان ابراہیم صدر امینی۔ سید میر جاج اُنسی، انیسی، اوحدی، اہلی ترشیزی۔
ب	بابر قلندر۔ عبدالباقی باقی۔ بدیع الزماں میرزا بدیعی۔ بساطی، بہشتی حصاری عبداللہ مروارید بیانی، بیضائی حصاری بیکسی۔
ت	تابعی۔ تابی۔

[1] مسودہ میں یہ لفظ صحیح پڑھا نہیں جاتا ہے،

ث | اثری ثانی (ثانی تخلص ہے)

ج | عبدالرحمان جامی ۔ جانی بندری ۔ باباخردی ۔ جلال طبیب ۔ جلال عضد ۔ جلالی رفیقی ۔ جمشید معمائی ۔

ح | حافظ سعد شمس الدین حافظ شیرازی ۔ بنائی حالی ۔ سلطان علی حالی اوبہی حبیب کاشی حریفی ۔ ملک حسام ابن سلطان سکندر ہندی ۔ خواجہ حسن قندھاری ۔ حسن دہلوی حسن شاہ ۔ امیر حسینی سادات ۔ حکیمی طبیبی ۔ حلوائی سمرقندی ۔ حیدر کلوچ ۔ درویش حیدر تونی حیرتی ۔

خ | خاتمی ۔ خادمی ۔ امیر خسرو ۔ ناصر خسرو ۔ خسروی خلقی بخاری ۔ افصح المتکلمین خواجوی کرمانی ۔ خواجہ خوانندہ ۔ خواجہ خیابانی ۔ خیال ۔ خیالی ۔

د | داعی ۔ دائمی استرآبادی ۔ درویش دہکی ۔ سلطان علی دوائی ۔ دوست مرددوستی ۔ دوستی کاتب ۔ دیوانہ نیشاپوری ۔

ذ | سید ذوالفقار شروانی ۔

ر | محمد قورچی رامی ۔ قاضی عبدالرحمن رحمانی ۔ روح عطار[1] ۔ ریاضی سمرقندی ۔

ز | مولانا زین ۔

س | سالمی ۔ سائلی ۔ نواب شاہ حسین میرزا ساہی ۔ سرودی مروی ۔ سعد ۔ سعدی سلامی ۔ خواجہ سلمان ۔ سلمان ساوجی ۔ سہیلی ۔ سید[2] نعمت اللہ سید و ولی ۔ سیفی بخاری ۔

---

[1] یہ بھی تخلص ہے ، ع

نہ تنہا روح عطارش اسیر زلف مشکیں شد   بہر موے اسیرے ہست ہمچون روح عطارش

[2] سید نعمت اللہ کبھی سید کبھی ولی تخلص کرتے تھے ،

ش | حسن شاہ شاعر ۔ شامی ۔ امیر شاہی سبزواری ۔ شرف خیابانی ۔ شرف یزدی ۔ شمس حاجی شیرازی ۔ درویش مقصود تیر گر شوقی ۔ شہاب[1] معمائی شہیدی ۔

ص | امیر محمد صالح ۔ صانع ۔ دیوان صبحی اوبہی ۔ صدر لاجوردی ۔ صفائی اندجانی ۔ صفائی کرمانی ۔ صفی ۔ صیرفی ۔

ض | ضعفی ۔ ضیلو استرآبادی ۔ محمد قاسم ضیائی ۔

ط | طالب حاجمی ۔ مولانا محمد طاقی ۔ طالعی ۔ مولانا طوسی ۔

ظ | ابو طاہر طاہری کاتب ۔ ظہوری ارلات ۔ ظہیر ۔

ع | عابدی ۔ بایسنقر میرزا عادلی ۔ ملا میر عریانی ۔ عارف ولد ابوسعید درانی ۔ عارفی عالم بہقی ۔ قاضی عبدالرحمٰن ۔ عبید زاکانی ۔ عبیدی ۔ عراقی ۔ عصمت اللہ عصمت عضد بخاری ۔ امیر عطاء اللہ عطائی ۔ علمی قانونی ۔ عماد فقیہ ۔ خواجہ محمد عہدی ولد خواجہ احمد او ۔

غ | شاہ غریب میرزا غریبی ۔ غیاث قافیہ ۔ غیاثی لمی ۔

ف | شیخ ابوالوجد فارغی ۔ فاضلی امیر علی شیر خانی ۔ فخری ۔ خواجہ ابوالبرکہ فراقی ۔ فروغی سمرقندی ۔ فرہاد ۔ فریدون ۔ فضلی ہروی ۔ فغانی ۔ فکری ۔ علی فیضی ۔

ق | قاسم ۔ قاسم انوار ۔ قاسمی ۔ قبولی قندزی ۔ قیدی ۔

ک | کاتبی ۔ کامران میرزا ۔ احمد شاہ حسین کامی نوکرزی ۔ قاسم کاہی ۔ کمال خجندی ۔ خواجہ کمال الدین حسین ابن خواجہ نظام الملک طوسی ۔ کوکبی ۔

---

[1] او ح ہمایوں بادشاہت ۔ او راست ع

ظل حق شاہ ہمایوں کہ غبار قدمش   طعنہ بر مشک تر و عنبر سارا زدہ است

گ | گدائی۔ گلخنی۔

ل | شہاب الدین لسانی۔

م | مانی تبریزی۔ مجنوں زنقی۔ مجنوں قلندر سمرقندی۔ محمد ابن حسام۔ محمد بدخشی۔ محوی۔ محیی۔ مرادی کوکلتاش۔ مراقی۔ مسعود قمی۔ مسیحی۔ مشفقی۔ مغربی۔ مفلسی۔ مقبول۔ ملک باخرزی۔ امیر منصور قراالوعہ۔ منصور سادہ۔ مو بدھنہ۔ مہدی۔ میرالگرکوب۔ شیخ میرک۔ میرکی شیرازی۔ میرم۔

ن | نادر سمرقندی۔ نادری مروی۔ ناصر بخاری۔ ناصری۔ ناظری۔ صدرنامی لاجوردشوئے۔ نثاری تونی۔ نورغوریانی بخری۔ سلطان محمود ندائی۔ نرگسی۔ حکیم نزاری۔ سید نسیمی۔ نصیری۔ امیر حسن علی شیخ نظام۔ قاسم نظمی۔ نور کمال نوری۔ نوری سمرقندی۔ میرزا علی نویدی نیشاپوری۔ نویدی ہروی۔ نیازی بخاری۔

و | واحدی شیرازی۔ غیاث الدین زنگمزدہ قتی۔ وحید تبریزی۔ وصفی۔ امیر احمد جامی، وفائی سمرقندی۔ ولی آملی۔ شاہ نعمت اللہ سید وولی۔ (ہر دو تخلص)

ہ | عبداللہ ہاتفی۔ ہادی محتسب۔ ہادی مشہدی۔ ہاشم کمان گر۔ شاہ جہانگیر ہاشمی۔ ہلالی۔ ہمام تبریزی۔ ہمایوں بادشاہ[۵]۔ ہمتی مروی۔ آقا شہاب الدین ہندی۔ ہوائی۔

ی | امیر محمد یوسف یتیمی۔ یوسف ہنہ۔ یوسفی طبیب۔ سلطان یعقوب۔ شاہ بیگ یقینی۔ یقینی کاتب۔

جملہ شعراء ۲۳۶۔

۵ہ ہمایوں بادشاہ می گوید۔

یقیم شد غم تو در دلم چہ چارہ کنم	عجب غنیمت اگر دل زنگ خارہ کنم

متنبی کی شخصیت اور شاعری

از جناب شفیق احمد خاں ندوی لکچرر عربی اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

چوتھی صدی ہجری میں دولت عباسیہ کا آفتاب اقبال عین نصف النہار پر ضو نگن تھا، اس کے حدود سلطنت کی وسعت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ دور دراز کے بکثرت علاقوں نے مرکزی اقتدار کی گرفت سے نکل کر اپنی علیحدہ چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں، بلاشبہہ سیاسی حیثیت سے یہ انقلاب خلافتِ بغداد کی کمزوری کا باعث ضرور ہوا، لیکن شعر و ادب اور علم و فن کو اس سے بے انتہا عروج نصیب ہوا، کیونکہ سلطنت آل بویہ، دولت سامانیہ، حمدانیہ، فاطمیہ اور غزنویہ کی باہمی مسابقت سے علم و ادب کا سیلاب سا آگیا تھا، ان حکومتوں کے ادب نواز حکمرانوں کے دربار باکمال شعراء کی نواسنجیوں سے پرشور تھے، علمی و ادبی ترقی کے اسی عہد زریں میں ابوالطیب متنبی نے اپنے فکر و شعور کی آنکھیں وا کیں، شعرائے مولدین کے طبقہ میں جن شاعروں نے اپنی عظمت اور بقائے دوام کے یادگار نقوش چھوڑے ہیں اُن میں ابو تمام، بحتری، بشار اور ابو نواس کے ساتھ متنبی کا نام بھی ممتاز اور سرفہرست ہے، بلکہ کچھ نقادوں نے اس کو بعض حیثیتوں سے دوسرے ہم عصر شعراء پر فوقیت و ترجیح دی ہے،

متنبی کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت کے پیش نظر اہل سیر و تنقید نے اس کے ساتھ خصوصی اعتناء کیا ہے، علامہ ثعالبی نے تو اپنی شہرۂ آفاق تصنیف یتیمۃ الدہر

میں اس پر تقریباً سو صفحے لکھ ڈالے ہیں، اور اب عربی زبان میں متنبی پر مستقل اور نہایت وقیع
کتابیں منصۂ شہود پر آگئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ متنبی کے شاعرانہ کمال اور اس کے محاسن کلام
کے اثرات بہت دور رس ثابت ہوئے، آج تک اہل علم برابر اس کو خراجِ تحسین پیش
کرتے آرہے ہیں، عرصہ ہوا مصری رسالہ "الہلال" میں الکتب التی افادتنی کے عنوان
سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا، جس میں تقریباً سب ہی اظہار خیال کرنے والوں
نے متنبی اور اس کے دیوان سے اپنی شیفتگی اور اس کے غیر معمولی اثرات کا نہایت شاندار
الفاظ میں ذکر کیا تھا، دیوان متنبی کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا
ہے کہ ابتک اس کی چالیس سے زیادہ شروح کی تحقیق ہو چکی ہے، ذیل کے مضمون میں بھی
متنبی کی شخصیت اور محاسن کلام کا اجمالی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حیات و شخصیت ابو الطیب احمد بن حسین المتنبی ۳۰۳ھ/۹۱۵ء میں بمقام کوفہ ایک نہایت غریب
اور فلاکت زدہ سقہ کے گھر پیدا ہوا، اور وہیں ابتدائی نشو و نما پائی، پھر اس کا باپ اپنے
بیٹے کی تعلیم و تربیت کے خیال سے اس کو لیکر شام چلا گیا، جہاں متنبی کی صلاحیتوں کو آزادی
کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع ملا، وہ فطرۃً عالی ہمت، ہمہ جو اور جاہ و شرف کا دلدادہ
تھا، والیِ انطاکیہ ابو العشائر کے توسط سے حلب پہنچا، جہاں ایک عرصہ تک مشہور
حکمراں سیف الدولہ کی اور اس کے بعد کچھ دنوں مصر کے مالک کافور اخشیدی کی مدح سرائی
کرتا رہا، عضد الدولہ کے دامن دولت سے بھی کچھ عرصہ وابستہ رہا، بالآخر رمضان
۹۶۵ء میں معز الدولہ کے دربار کو بغداد جاتے ہوئے کسی پرانی رنجش کے باعث فاتک
ابن ابوجہل نے اس کا چراغ حیات گل کر دیا، اس وقت متنبی کی عمر ۵۱ سال کی تھی،

ذہانت بچپن ہی سے متنبی کی ذہانت کے چرچے شروع ہو گئے تھے، وہ نثر ہو یا نظم جو کچھ بھی سنتا

خود بخود یاد ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں اس کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ اس نے ابو عبید[1]
کی لغت کو صرف ایک بار دیکھکر اول سے آخر تک زبانی سنا دیا تھا،

وہ بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا، سن رشد تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک
قادر الکلام شاعر بن گیا، اس کے ساتھ ہی لسانیات اور لغت پر بھی عبور حاصل کر لیا،
ایک مرتبہ اس کے ایک استاد شیخ ابو علی فارسی نے پوچھا فِعلیٰ کے وزن
پر کتنے جمع آتے ہیں؟ متنبی نے برجستہ حجلیٰ اور ظربیٰ دو وزن بتائے۔ شیخ کا بیان ہے
کہ میں تین دن تک لغت کی کتابوں میں اس وزن پر کسی تیسرے لفظ کی تلاش میں سرگرداں
رہا، مگر نہ پا سکا،

تعلیم و تربیت ۳۲۱ھ میں متنبی اپنے باپ کے ساتھ شام پہنچا، اس وقت وہ سن شباب کو
پہنچ چکا تھا، اس کے بعد تقریباً پندرہ سال تک وہ شام میں تعلیم حاصل کرتا رہا، ساتھ ہی
معاش کے لیے شامی امراء کی قصیدہ خوانی کر کے پیٹ پالتا رہا، عربی زبان کے محاورات
و امثال سیکھنے کے لیے اس نے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا،

اسی اثنا میں اس کے والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا جس کے باعث
اس کی زندگی نہایت بے کیف ہو گئی، اب وہ محض ایک پیشہ ور قصیدہ گو بن گیا،
امراء کی ثنا خوانی کر کے روزی حاصل کرتا، نامساعد حالات، افلاس و تواتر مصائب
نے اس کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، مگر اس کے عزم و ہمت کی بلندی اور حب جاہ میں کوئی
فرق نہ آیا، وہ کہتا ہے:

---

[1] یتیمۃ الدہر ثعالبی ج ۱

ضاق صدری وطال فی الرز ... ق قیامی وقل عنہ قعودی
ابداً اقطع البلاد ونجمی ... فی نحوس وہمتی فی سعودی

[مصائب سے میرا دل تنگ ہو گیا، اور طلب رزق میں قیام اور تھکن کی کثرت سے
مجھ پر عیش و عشرت حرام ہو گیا، گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس حال میں پھرتا ہوں
کہ میری قسمت نحوست کے گرداب میں پھنسی ہے، لیکن عزم و ہمت ہیں کہ ہر آن
کامیابی کی جانب مائل کیے جا رہے ہیں]

شام میں اس نے تقریباً ۴۴[1] قصائد لکھے جن میں ۳۲ میں امرائے شام کی مدح سرائی
تھی ان قصائد میں ممدوحین کے علاوہ اس نے خود اپنی تعریف اور زمانہ اور اہل زمانہ
کی سرد مہریوں کا شکوہ کیا ہے، پانچ قصائد میں زیادہ تر اپنی خواہشات کا ذکر، اپنی
ذات پر فخر اور دنیا والوں پر عتاب ہے، یہ قصائد آمال و آلام کے آئینہ دار
ہیں، ایک قصیدہ میں اچھے پڑوسیوں اور شریف لوگوں کے مفقود ہو جانے کا رونا روتے
ہوئے کہتا ہے کہ زمانہ میں شرافت کا جنازہ ہی نکل چکا ہے ؎

ولم ارى مثل جیرانی ومثلی ... لمثلی عند مثلہم مقام
بارض ما اشتہیت رأیت فیہا ... فلیس یفوتہا الا الکرام

علی حمزہ بصری متنبی کی سیرت و شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ متنبی نے کبھی
نماز، روزے اور تلاوت قرآن سے کوئی خاص واسطہ نہیں رکھا، لیکن جھوٹ اور
دیگر بدکاریوں سے بھی وہ محفوظ رہا، دیگر اہل نظر نے اس کے اخلاق و کردار کا تذکرہ
کرتے ہوئے اس کو پاک باز کردار کا حامل بتایا ہے، کیونکہ وہ عیش و طرب کی مجلسوں

[1] جوزف الہاشم: المتنبی ص ۴۴

سے دور رہا، شراب و کباب سے بھی اس کو نفرت تھی تصنع اور تکلف سے بھی وہ بیزار تھا،
شہر کی چمک دمک کے مقابلہ میں دیہات کے حسن سادہ کو زیادہ پسند کرتا تھا ایک جگہ کہتا ہے ؎

حسن الحضارة مجلوب بتطرية ... وفی البداوة حسن غیر مجلوب

ابن فورجہ کا بیان ہے کہ متنبی بڑا بہادر، بے باک، صاف گو، تلخ زبان اور آداب مجلس
سے پوری طرح واقف تھا، اس میں سوائے حرص اور بخل کے کوئی ایسی بات نہ تھی جو
باعث ننگ و عار ہو،

حقیقت یہ ہے کہ متنبی کی پوری زندگی کبر و نخوت سے بھری ہوئی تھی، جیسا کہ اس کے
تخلص سے بھی ظاہر ہے، خود متنبی کے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلص اس کو لوگوں کی
طرف سے بطور طنز کے ملا تھا جو بعد میں اس کے نام کا جزء قرار پا گیا، ایک بار جب وہ خود
کو جود و کرم کا پروردہ اور دنیائے شعر و سخن کا امام مطلق بتاتے ہوئے دشمنوں کے حق میں
ہلاکت و وبال اور زہر ہلاہل بتا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خدا میری قوم کو سمجھے کہ اس نے میرے
ساتھ وہی نامناسب معاملہ اختیار کر رکھا تھا جو حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ انکی
ناکارہ قوم کا تھا ؎

انا ترب الندى ورب القوافی ... وسمام العدى وكيد الحسود
انا فی امة تداركها الله ... غريب كصالح فی ثمود

تو لوگوں نے اس کو متکبر اور بناوٹی نبی (متنبی) کے نام سے پکارنا شروع کر دیا، جو رفتہ رفتہ
مشہور ہو گیا،[1]

دعویٰ خلافت | ناتجربہ کاری اور عنفوان شباب ہی میں حب جاہ نے اسکو خلافت و

[1] احمد سید البغدادی: امثال المتنبی وحیاتہ ص ۳۰

امامت کی ہوس کا دیوانہ کر دیا، چنانچہ اس نے خلافت کا دعویٰ کر دیا، بعض مریدین بھی ارد گرد جمع ہو گئے، امیر حمص کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے متنبی کو قید کرا دیا، جیل خانہ سے متنبی نے امیر حمص کی شان میں ایک قصیدہ لکھ بھیجا، جس کا مطلع یہ ہے:

دعوتك لما براني البلى — أوهن رجلي ثقل الحديد

اس قصیدہ نے امیر حمص کو پگھلا دیا، اس نے اس کے صلہ میں صرف اتنا کیا کہ اس کو قید سے رہا کر دیا۔

ادعائے نبوت | بہت سے مورخین نے لکھا ہے کہ جوانی کی عمر سے متجاوز ہو کر اس نے شام کے مشہور قبیلۂ بنو کلب میں جا کر نبوت کا بھی دعویٰ کیا تھا، بہت سے حواریین بھی فراہم ہو گئے تھے، اپنی چرب زبانی اور قادر الکلامی کی بنا پر اس نے ایک مصحف بھی گڑھ لیا تھا، اخشیدیہ کے نائب لولو (والی حمص) نے فوج کے ذریعہ اس کی اور اس کے سینکڑوں متبعین کی سرکوبی کی اور اس کو مقید کر دیا، ساتھی فرار ہو گئے اور وہ ایک طویل مدت تک قید میں رہا، پھر توبہ کر کے رہائی حاصل کی۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اس نے عنفوانِ شباب میں خلافت کا دعویٰ ضرور کیا تھا، نبوت کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔

متنبی کی وجہ تسمیہ | ثعالبی نے ابن جنی کا بیان نقل کیا ہے کہ اس نے ابو الطیب سے سنا، وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے متنبی کے لقب سے محض میرے اس شعر کی وجہ سے پکارا جاتا ہے:

انا فی امۃ تدارکہا اللہ — غریب کصالح فی ثمود

کیونکہ اس شعر میں خود کو حضرت صالحؑ جیسے جلیل القدر نبی سے مشابہت دی ہے۔[2]

---

[1] تاریخ بغداد [2] ابو منصور الثعالبی: یتیمۃ الدہر ج ۱ ص ۹۳

یاقوت نے "معجم الادباء" میں متنبی کے معاصر شاعر ابو حسین ناشی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ناشی ۳۲۵ھ میں کوفہ کی جامع مسجد میں کچھ اشعار لکھوا رہا تھا، ابو الطیب وہاں موجود تھا، وہ اس وقت تک متنبی کے لقب سے جانا نہیں جاتا تھا، متنبی خود کو اس لقب سے ملقب کرنا پسند نہیں کرتا تھا، تحقیق کرنے پر وہ کہتا تھا کہ یہ لقب "نبوۃ" سے مشتق ہے، جس کے معنی المرتفع من الارض (بلند ٹیلا) کے ہیں،

ان تمام حقائق کی بنا پر صحیح سچی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس نے محض خلافت کی بیعت کا اعلان کیا تھا، نبوت کا نہیں، اس کی بود و باش بھی بچپن ہی سے باغی و سرکش قبائل میں رہی تھی، یہ قبائل اس کی معجز نمائی اور قدرت کلام کے گرویدہ تھے، انہی میں سے کسی نے اپنے ایک شعر میں اس کو پیغمبر شعر و سخن کہا، اور یہ کہا کہ اس کے معجزات معانی آفرینی میں ظاہر ہوئے ہیں:

هو في شعره نبي ولكن — ظهرت معجزاته في المعاني

انطاکیہ اور جنوبی شام میں | وہ بے کسی و بے بسی کے عالم میں حمص سے حلب پہنچا، وہاں سے غیر مطمئن ہو کر انطاکیہ روانہ ہو گیا، اور وہاں کے شرفاء و امراء کی مدح سرائی کر کے اپنا پیٹ پالتا رہا،

غرض اس طرح ایک عرصہ تک وہ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، پھر انطاکیہ میں سیف الدولہ کے گورنر ابو العشائر کے ہاں پناہ گزیں ہوا، ابو العشائر کی مدح میں کئی قصائد لکھے جن میں سب سے مشہور یہ قصیدہ ہے:

مالي لا امدح الحسين ولا — أبذل مثل الود الذي بذله

ابو العشائر نے اس کی ہر ممکن قدر افزائی کی، اور متنبی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مؤثر

انداز میں سیف الدولہ کے حضور تعارف کرایا، سیف الدولہ نے متنبی کو اپنے دربار گہربار
میں بلالیا، چنانچہ اب متنبی انطاکیہ سے حلب آگیا،

سیف الدولہ کے دربار میں | ۹۴۸ء (۳۳۷ھ) میں متنبی سیف الدولہ کے دربار سے منسلک
ہوا، بے شبہ یہ متنبی کا دور زریں تھا، نو سال (۳۴۶ھ) تک وہ مسرور ومطمئن تھا، اپنے
آقا سیف الدولہ کی تعریف وتوصیف اور اس کے لشکر، فتوحات اور کارناموں کے
تذکرہ میں رطب اللسان رہا، یہیں سے اس نے فن حرب اور شہ سواری کی تربیت حاصل
کی، یہاں وہ ایک مخلص دوست، جانباز ساتھی، جان نثار مجاہد، یگانہ روزگار ادیب
اور جادو بیان شاعر کی حیثیت سے خلوت وجلوت میں سیف الدولہ کا دستِ راست رہا
ڈاکٹر ذکی المحاسنی لکھتے ہیں:۔

"کذلک بدأ أبو الطیب یحیا الطور الثانی من سیرته فبقی فی حلب
من سنة ۳۳۷ حتی ۳۴۶ وفی هذا الطور قال أروع شعره فی
تصویر المعارك والوقائع وقد ازداد معرفة بالسلاح والحرب
منذ لزم سیف الدولة" [۱]

یہاں وہ سیف الدولہ کی تعریفوں کے پل باندھتا رہا، سیف الدولہ مسرور ہو کر
اسے مال ومتاع سے نوازتا رہا،

کم وبیش نو سال کے بعد متنبی ان تمام تنعمات سے اکتا گیا، حب جاہ اس کی فطرت
تھی، وہ کسی نہ کسی طرح مصر کا والی بننا چاہتا تھا، چنانچہ اب خوب سے خوب تر کی جستجو میں
اس کا دل زیادہ سرگرم عمل رہنے لگا، جیسا کہ وہ اشارہ بھی کر رہا ہے۔

[۱] الدکتور ذکی المحاسنی: ابو الطیب ص ۱۰۲

ولکن قلبی بین جنبی ماله — مدی ینتھی بی فی مراد احده

دوسری بات یہ کہ سیف الدولہ بذات خود ایک عالم اور بلند پایہ نقاد سخن تھا،
وہ حقیقت سمجھنے لگا، اس کا دربار شعراء وادباء کا مرکز تھا، متنبی اپنے فن پر نازاں ہوگیا،
معاصرین کی تحقیر وتذلیل کرنے لگا، جواباً دوسرے لوگ بھی اس سے جلنے لگے، ایک بار اس نے
یہ کہا کہ شاعر تو درحقیقت متنبی ہی ہے، باقی سب لوگ متشاعر (نقلی شاعر) ہیں، اسی طرح
جس طرح تلواریں بہت ہیں مگر سیف الدولہ (حکومت کی تلوار) بس ایک ہے [۱]

خلیلی انی لا اری غیر شاعر — فکم منھم الدعوی ومنی القصائد
فلا تعجبا ان السیوف کثیرة — ولکن سیف الدولة الیوم واحد

تو اس شعر پر تمام درباری ادباء چراغ پا ہوگئے۔

باہمی رقابتیں بڑھتے بڑھتے اس درجہ تک پہنچ گئیں کہ ایک بار بھرے دربار میں مشہور
شاعر ابن خالویہ سے متنبی کی سخت جھڑپ ہوگئی، ابن خالویہ نے اپنی کنجیوں کا گچھا متنبی کو مار دیا،
سیف الدولہ دیکھتا رہا، کوئی بازپرس بھی نہ کی، متنبی کو اس سے شدید صدمہ لاحق ہوا، اور
وہ کچھ دن خاموش رہا، پھر ایک دن (دمشق کے قصد سے) وہ سیف الدولہ کو چھوڑ کر رخصت
ہوگیا،

متنبی نے سیف الدولہ کی شان میں تقریباً ۸۰ طویل قصائد اور ۱۶۰۵ اشعار لکھے،
متقدمین ومتاخرین میں شاید ہی کسی شاعر نے اتنا بڑا نذرانۂ عقیدت کسی بادشاہ کے حضور
پیش کیا ہو، خزانۃ الادب میں عبد القادر بغدادی لکھتے ہیں کہ "صرف چار سال میں سیف الدولہ
نے ۳۵ ہزار دینار سے زیادہ متنبی کو دیے"،

ملک کافور کے دربار میں | ۹۵۷ء میں متنبی مصر کے ملوک وسیاہ فام بادشاہ کافور اخشیدی

کے دربار سے وابستہ ہوا، کافور کے ہاں وہ برابر کسی نہ کسی ریاست کا والی بننے کا آرزومند رہا، چنانچہ اشاروں کنایوں سے گذر کر پھر وہ واضح طور پر حرفِ مطلب زبان پر لے آیا کہتا ہے ؎

ابا المسك هل في الكأس فضل أناله   فانی اغنی منذ حين وتشرب

اے ابو المسک کافور کیا آپ کے پیالے میں کچھ بچا کھچا بھی نہیں ہے؟ میں ہوں کہ ایک عرصے سے محض گا رہا ہوں اور آپ تنہا نوش فرما رہے ہیں،

اس کے بعد کہتا ہے ؎

وهبت على مقدار كفي زماننا   ونفسي على مقدار كفيك تطلب

اذا لم تنط بي ضيعة او ولاية   فجودك يكسوني وشغلك يسلب

آپ نے زمانہ کو میری ہتھیلی کے بقدر عطا کیا، میں تو آپ کی ہتھیلی کے بقدر کا طلبگار ہوں اگر آپ نے کسی جائداد یا ولایت کے منصب سے سرفراز نہ کیا تو آپ کا جود و سخا مجھکو مالامال کرے گا، پھر بھی آپ کا ولایت سے مجھکو محروم رکھنے کا کام سوگوار رکھے گا۔

کہا جاتا ہے کہ کافور شروع میں اس بات پر راضی تھا کہ وہ اس کو کسی صوبہ کا گورنر بنا دیگا مگر پھر کچھ ایسی باتیں پیش آئیں کہ وہ اس کے اخلاص پر شک کرتے ہوئے ٹال مٹول کر گیا، متنبی کافور کے دربار میں ساڑھے چار سال تک رہا، اس عرصہ میں اس نے کافور کی مدح میں دس قصائد کہے جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۳۰۳ ہے،

متنبی ۹۶۱ء میں مصر سے فرار ہو گیا، اس وقت اس نے جو قصیدہ کہا ہے وہ آج بھی حسرت و یاس کی زندہ تصویر ہے، اتفاق سے وہ عید کا دن تھا، لوگ خوشیاں منا رہے تھے لیکن متنبی حسرت کے عالم میں کہہ رہا تھا ؎

عيد بأية حال عدت يا عيد   بما مضى ام لأمر فيك تجديد

اما الاحبة فالبيداء دونهم   فليت دونك بيدا دونها بيد

اے عید تو کس حالت میں پھر اس بار آئی ہے؟ یادِ ماضی لیکر یا کوئی نیا پیغام؟ آج تو میرے اور میرے محبین کے درمیان دوری کی زبردست خلیج حائل ہے، کاش کہ میرے اور تیرے درمیان بھی دوری کی خلیج حائل ہوتی اور تو آج آتی ہی نہیں۔

سیف الدولہ کی پیشکش | ربیع الاول ۳۵۱ھ میں متنبی کوفہ پہنچا، جب مصر سے اسکے فرار کی خبر سیف الدولہ کو ملی تو اس نے اپنے ایک لڑکے کو ہدایا و تحائف کے ساتھ متنبی کے پاس بھیجا اور اسے دوبارہ حلب واپس آنے کی درخواست کی، متنبی کی خودداری نے اسے گوارا نہ کرتے ہوئے محض ایک مدحیہ قصیدہ جواباً ارسال کر دیا،

ابن العمید الکاتب سے ملاقات | ۳۵۴ھ میں متنبی مشہور ادیب ابن العمید کے پاس پہنچا، ابن العمید نے اسکے ساتھ نہایت عزت و اکرام کا سلوک کیا، اس نے متنبی کو عضد الدولہ کے یہاں جانے کا مشورہ دیا، یہی نہیں بلکہ اس نے عضد الدولہ سے متنبی کا شاندار تعارف بھی کرایا،

متنبی عضد الدولہ کے دربار سے صرف چھ ماہ وابستہ رہا، اس قلیل عرصہ میں اسکو خاصا اطمینان حاصل رہا جس کی وجہ سے اس نے کئی شاندار قصیدے کہے، جب متنبی نے پہلا قصیدہ پیش کیا، تو عضد الدولہ نے اسے عود، عنبر، مشک، قیمتی ریشمی چادر، مشکی گھوڑا، عمامہ، ہندی تلوار (جس کا دستہ سونے کا تھا) اور پانچ سو دینار عطا کئے، اس مختصر سے دور میں متنبی کے کلام میں درباداری کم اور ادبیت زیادہ نمایاں رہی،

قتل کے اسباب | شعبان ۳۵۴ھ میں متنبی نے عضد الدولہ سے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے عراق جانا چاہتا ہے، عضد الدولہ نے اس کو شیراز میں رکنے کو کہا اور اس کے عراق ہی پہنچنے کیلئے

اس نے کوئی انتظام کیا، کافور کے دربار سے متنبی عراق ہی کے ارادہ سے نکلا تھا، دوسرے روز عراق کے سفر پر نکل پڑا، رمضان ۳۵۳ھ میں وہ شہر واسط میں اپنے دوست ابو نصر جبلی کے یہاں قیام پذیر ہوا، اس دوران اس نے بدشگونی و مایوسی سے بھرپور اشعار کہے، درج ذیل شعر سے اس کی قنوطیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

بم التعلل لا اهل ولا وطن ولا نديم ولا كاس ولا سكن

شاید اسی مفہوم کو مرزا غالب نے اپنے انداز میں یوں کہا ہے ؎

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ

نہ رقص پری پیکراں بر بساط نہ غوغائے رامش گراں در رباط

کئی روز کے بعد متنبی ابو نصر کے پاس سے رخصت ہوا، بدویوں کی ایک جماعت فاتک ابن ابو جہل اسدی کی سرکردگی میں اس کے پیچھے لگ گئی کیونکہ اس نے فاتک کے بھانجے "ضبہ" کی ہجو کرتے ہوئے اس کی ماں (جو فاتک کی بہن تھی) کو گالی دی تھی، راستے میں یہ لوگ متنبی پر ٹوٹ پڑے، اس حملہ میں متنبی کا لڑکا قتل ہو گیا، حملہ آوروں نے اس کا سارا مال لوٹ لیا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ فاتک کو دیکھ کر متنبی نے بھاگنا چاہا، مگر اس کے غلام "مفلح" نے متنبی کا مشہور شعر

الخيل والليل والبيداء تعرفني والسيف والرمح والقرطاس والقلم

یاد دلایا، اس پر متنبی لوٹ پڑا اور دست بدست لڑتا ہوا مارا گیا، مفلح بھی قتل کر دیا گیا، بعض لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ شاید عضد الدولہ کی ناخوشی ناگواری متنبی کے قتل کا باعث بنی لیکن درحقیقت فاتک اور ضبہ کی ہجو گوئی ہی اس کے دردناک قتل کی بنیاد کہی جا سکتی ہے

بغداد کے پاس نعمانیہ میں قتل کے بعد متنبی کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی، دوسرے روز ابو نصر جبلی[1] نے آکر تجہیز و تکفین کی، یہ حادثہ ۲۸ رمضان ۳۵۴ھ میں پیش آیا تھا، (باقی)

[1] محمد زغیف لماکم: ابو الطیب المتنبی ص ۸

ادبیات

دار المصنفین

از

جناب محمود الرحمن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی

"دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان کے درمیان تاریخی سمجھوتے پر یہ نظم کہی گئی"

اے کہ تو ہے علم و دانش کا چمن اے کہ تو وجہ فروغ انجمن

اے کہ تو ہے مظہر فکر و نظر ہے ہر اک ذرہ ترا رشک گہر

اے کہ تجھ میں خون شبلیؔ موجزن اے کہ تجھ میں ہے نہاں سیدؔ کا فن

اے کہ تجھ سے بزم اردو ضوفشاں تو شعور و آگہی کا اک نشاں

اے کہ تو تاریخ کا اک سنگ میل تیری ہر تحریر ہے بانگ خلیلؑ

تجھ سے ہے تحقیق کو حاصل فروغ تو نے واضح کر دیا صدق و دروغ

اے کہ تو ہے بے نظیر و بے مثال تیری مطبوعات ساری لازوال

سیرت سرکارؐ ہے اک شاہکار قابل صد احترام و افتخار

منضبط تاریخ کے اوراق ہیں جلوہ گر ماضی کے سب اسباق ہیں

محترم اجداد کی تحریر ہے دور رفتہ کی حسیں تصویر ہے

ہے یہ سرمایہ عظیم و معتبر آشنا ہیں اس سے سب اہل نظر

ہو مبارک اہل پاکستان کو | پالیا ہے گنج عرفان کو
فاؤنڈیشن سے ہوا عہد و قرار | نقش شبلی ہوگیا یاں آب‌شکار
سب کتابیں چھپ کے نکلیں گی یہاں | ہوگا روشن علم و دانش کا جہاں
پائیں گے ہم عہدِ رفتہ کا سراغ | ہوں گے پُر اپنی روایت سے دماغ

شکر آبا کا خزینہ مل گیا
علم و فن کا اک دفینہ مل گیا

ترجمہ غزلِ خسرو

از ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری، صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

"ڈاکٹر ولی الحق انصاری صاحب نے ناظرین معارف کے لئے حضرت امیر خسرو کی مشہور غزل ع
ع از چشم تو گہہ بست ز تو جاں شکارتر" کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو انکے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے (معارف)

تیری نگہ سے تجھ سے جو ہے جاں شکارتر | دنیا میں دل کہاں مرے دل سے فگارتر
شیریں لبوں سے نکلے ہے تیری جو تلخ بات | آب حیات سے ہے مجھے سازگارتر
نالاں ہے تجھ سے خلق، کہاں تُو خفا کے ساتھ | میں ہر جفا پہ تیری ہوں کچھ شرمسارتر
دل چیرتا ہوں سامنے پھر بھی نہیں یقیں | دنیا میں کون تجھ سے ہے بے اعتبارتر
سمجھا رہا تھا دل کو کہ الفت سے ہوشیار | بولی یہ عقل مجھ سے بھی رہ ہوشیارتر
الفت میں بند ہوتا ہے دشمن کا ناگوار | ہے پند دوست اس سے بھی کچھ ناگوارتر
دل پوچھتا ہے کیوں نہیں پہلا سا بیقرار | باور کرے تو کہتا ہوں ہے بیقرارتر
گھستا ہوں سنگ در پہ ترے جبکہ ذجبیں | پاتا ہوں اپنے بخت کو کچھ بے عیارتر

خسرو کے اس سوال کا تو ہی جواب دے
ہے کس وجہ سے آنکھ مری سوگوارتر

مطبوعات جدیدہ

حضرت مولانا داؤد غزنویؒ - مرتبہ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]
پتہ ۔ مکتبہ غزنویہ، ۴ شیش محل روڈ، لاہور

مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم جمعیۃ اہل حدیث کے ممتاز عالم اور پنجاب کانگریس کے مشہور رہنما تھے، مجلس خلافت اور ترک موالات کے زمانہ سے وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں سرگرم عمل تھے، برسوں پنجاب کانگریس کے سکریٹری وصدر، صوبائی اسمبلی کے ممبر اور جمعیۃ علمائے ہند کے نائب صدر رہے، مگر ۴۶ء میں بعض وجوہ سے جن کی تفصیل اس کتاب میں درج ہے، مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، اور تقسیم کے بعد امرتسر سے لاہور منتقل ہوگئے اور وہاں بھی قومی و سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں، ان سرگرمیوں کے ساتھ وہ علمی، تعلیمی اور تحریری خدمات بھی انجام دیتے رہے، زیر نظر کتاب میں ان کے خدمات و کمالات کے ساتھ ان کی سیرت و شخصیت کا جائزہ ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ان کے علم و فضل، زہد و اتقا، درس و تدریس، خطابت و صحافت اور وعظ و ارشاد اور ملی و سیاسی خدمات سے متعلق مختلف ارباب علم و قلم کے تاثراتی مضامین ہیں، اس میں مولانا محی الدین قصوری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا محمد حنیف ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ آغا شورش کاشمیری، اور رئیس احمد جعفری وغیرہ کے مضامین کے ساتھ مولانا عبدالماجد

دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، اور مفتی محمد حسن مرحوم کی مختصر تحریریں بھی ہیں، دوسرے حصہ میں لائق مرتب نے جو مولانا مرحوم کے فرزند ہیں ان کے حالات و سوانح قلمبند کئے ہیں، اس میں ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، تصنیفات، علمی، تعلیمی، صحافتی، جماعتی اور سیاسی خدمات، اخلاق و عادات، مذہبی خیالات اور فقہی عدم تشدد وغیرہ کا ذکر ہے، آخر میں اردو فارسی میں ان کے پسندیدہ اشعار کا ایک انتخاب بھی دیا گیا ہے، مولانا کے لائق فرزند نے یہ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی تھی، مگر دنیا کی زندگی بھی کتنی ناپائدار ہے کہ کتاب شایع ہونے کے بعد ہی سعادت مند فرزند بھی اپنے والد ماجد سے جاملے، امید کہ یہ کتاب خاص خاص حلقوں میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی

قرآن مجید منظوم ترجمہ (۲ جلد) از جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم
کاغذ کتابت و طباعت نہایت عمدہ صفحات ہر جلد ۱۲۰ مجلد قیمت فی جلد ؏۱۵
ناشر قزلباشان پوسٹ بکس نمبر ۸۰۹، صدر کراچی نمبر ۳ (پاکستان)

آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم اردو کے بلند پایہ شاعر تھے، ان کی یادگاروں میں قرآن مجید کا ایک منظوم ترجمہ بھی ہے، اسکے بعض اجزا مرحوم کی زندگی میں چھپے تھے، اب ان کے عزیز اور قدرداں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دو دو پارے کا ترجمہ ایک جلد میں شائع کر رہے ہیں، زیر نظر دونوں جلدیں شروع کے چار پارے کے ترجموں پر مشتمل ہیں، نظم تو درکنار قرآن مجید کا نثری ترجمہ بھی آسان نہیں ہے، اس لیے اس کے منظوم ترجمے کی کوشش سے متعلق یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ سعی حاصل ہے کہ نہیں؟ مگر آغا صاحب کو اپنی شاعری کی قدرت پر کچھ ایسا اعتماد تھا کہ اس مشکل کام کو آخر پایۂ تکمیل تک پہونچا کر رہے، انھوں نے یہ احتیاط کی ہے کہ جہاں لفظی ترجمہ کی مکمل پابندی نہیں ہوسکتی ہے وہاں اصل و زوائد میں امتیاز

کے لیے اضافہ کو قوسین کے اندر دیا ہے، اردو میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بہت مقبول ہے، اس منظوم ترجمہ میں اسی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، پہلے کالم میں قرآنی آیتوں کے نیچے حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ دیا گیا ہے، اور دوسرے کالم میں آغا صاحب کا منظوم ترجمہ درج ہے، جس جذبہ سے یہ ترجمہ منظوم کیا گیا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا صلہ عطا فرمائے، اور قارئین کو اس کی قدردانی کی توفیق دے،

حج و مقامات حج - مرتبہ مولانا محمد رابع ندوی، تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۷۰، قیمت صر پتہ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳، لکھنؤ۔

حج اسلام کا بنیادی رکن اور ملت ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار ہے، یہ ہر مسلمان پر زندگی بھر میں بشرط وسعت ایک ہی دفعہ فرض ہے، اس کے ارکان و مناسک مختلف جگہوں میں ایک طویل عرصہ تک بجالانے پڑتے ہیں، اس لیے حجاج کی واقفیت و رہبری کے گوناگوں اہتمام کے باوجود بھی ان کی ادائیگی میں سہو کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے حج سے متعلق متعدد کتابیں اور سفرنامے لکھے گئے ہیں، لائق مصنف کو حج و زیارت کی سعادت متعدد بار میسر آئی ہے، اور ان کو اپنے خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معیت میں حجاز مقدس میں بار ہا ہفتوں اور مہینوں قیام کرنے کا موقع بھی ملا ہے، ان کو ملک عرب سے بھی بڑی واقفیت ہے چنانچہ اس سے پہلے وہ "جزیرۃ العرب" کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھ چکے ہیں، اور اب انھوں نے حج اور اس کے سلسلہ کے مقامات کے متعلق یہ مفید و پرازمعلومات کتاب لکھی ہے، اس میں حج کی اہمیت و فضیلت، حج و عمرہ کی ادائیگی کی صورتوں، ان کے جملہ ارکان و مناسک

اور مسنون دعاؤں کے علاوہ سفرِ حج کے قوانین وضوابط، ساتھ لے جانے والے اسباب وسامان، جہازوں، بندرگاہوں، جدہ، مکہ، مدینہ اور دوسرے اہم مقامات کے متعلق تمام ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے عام سفرناموں اور حج پر لکھی ہوئی کتابوں کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ مفید ہے، جابجا مختلف مقامات کے نقشے اور عمارتوں کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں،

قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں۔ مرتبہ۔ جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۴۰۰ قیمت لعہ/ ناشر مکتبہ الحسنات، رام پور۔ یوپی۔

قرآن مجید کی جن آیتوں میں یہود کا تذکرہ ہے زیرِ نظر کتاب میں ان سب کو مختلف عنوانات کے تحت نقل کرکے ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی گئی ہے، اس سے یہود کی سرگزشت اور ان کی عظمت واقبال اور زوال وادبار کی مفصل داستان سامنے آجاتی ہے، نیز ان کی فتنہ انگیزی، بغاوت وسرکشی، نقضِ عہد، آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور خدا کے رسولوں کے انکار وقتل کے لرزہ خیز واقعات کی بھی اس میں تفصیل آگئی ہے، مصنف یہود کے اس آئینہ میں احکامِ الٰہی اور قرآن مجید کے سلسلہ میں مسلمانوں کی موجودہ روش پر اُن کو بھی تنبیہ وملامت کرتے گئے ہیں، یہ کتاب علمی وتحقیقی حیثیت سے چاہے زیادہ بلند پایہ نہ سمجھی جائے تاہم اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے،

بدایوں کے چند ادبا و شعراء مرتبہ جناب بشیر علی صدیقی۔ تقطیع خورد، کاغذ بہتر کتابت وطباعت معمولی۔ صفحات ۱۴۴، قیمت عہ/ پتہ: مصنف۔ گلی وحید بخش، محلہ سوتھہ بدایوں"

یہ جناب بشیر علی صدیقی کے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں بدایوں کے معروف وغیر معروف ادیبوں اور شاعروں کے ادبی وشعری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، دوسرے میں وہاں سے چھپنے والی یا وہاں کے اہلِ قلم کی بعض ادبی کتابوں، اور تیسرے میں وہاں سے شائع ہونے والے رسالوں اور اخبارات کا ذکر کیا گیا ہے، یہ سب مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں، اور اخباروں ورسالوں میں چھپ بھی گئے ہیں، کتابی صورت میں شائع کرتے وقت حشو وزوائد اور مکررات کو حذف کردینا چاہیئے تھا، کتابت وطباعت بھی خراب ہے، اور قیمت بھی زیادہ ہے،

ہم ایک ہیں:۔ مرتبہ جناب عرش ملسیانی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت، اچھی، صفحات ۲۴۰، قیمت عہ/ پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن وزارتِ اطلاعات ونشریات، حکومتِ ہند

اس کتاب میں قومی یکجہتی، اور ملک کے مختلف فرقوں اور قوموں کی یگانگت اور باہمی رواداری کا ذکر مختلف پہلوؤں سے ہے، ہندوستان قدیم زمانہ سے مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، لیکن اس کثرت اور رنگا رنگی کے باوجود یہاں وحدت اور یک رنگی کی شان ہمیشہ موجود رہی ہے، لائق مصنف نے پہلے ہندوستان کے گذشتہ عہد کی مختصر تاریخ بیان کرکے قومی یکجہتی کا تاریخی وتہذیبی پس منظر دکھایا ہے، پھر زبان، موسیقی، مصوری، رقص اور تعمیرات میں ملک کے تمام فرقوں کے ایک دوسرے کے دوش بدوش حصہ لینے کا تذکرہ ہے، لسانی میل جول کے سلسلہ میں اردو زبان کے کردار اور ہندوؤں کی اردو خدمات کا خاص طور سے جائزہ لیا گیا ہے، اسی ضمن میں ہندی زبان کے متعلق مسلمانوں کی خدمات کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے، ایک مستقل عنوان

کے تحت زیارت گاہوں اور میلوں ٹھیلوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپی کا ذکر ہے، آخر میں اُن صوفیوں اور سنتوں کے مختصر حالات اور زریں اقوال تحریر کئے گئے ہیں جنھوں نے خدا کی بندگی، خلق کی خدمت، اور انسانیت و اخوت کا درس دے کر سب کو پیار اور محبت کی تلقین، صلح و آشتی کا پیام اور اتحاد و یکجہتی کی دعوت دی ہے، ممکن ہے کہ مصنف کے ہر خیال سے اتفاق نہ کیا جائے، لیکن یہ کتاب قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور نفرت و اختلاف کو دور کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ قوم و وطن کی ایک مفید خدمت ہے،

تذکرہ حضرت سید شاہ اسمٰعیل قادری: مرتبہ جناب محمد معین الدین اخترصاحب (ایم۔اے۔ عثمانیہ) تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات:- ۱۲۸، قیمت:- للعہ ۵۰ پیسے (۱) ادبی ٹرسٹ بک ڈپو۔ کنارا بینک لمیٹڈ گن عابد روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (۲) معین منزل ۹۷۳/۹۴-۴-۲۰۔ خانہ باغ روڈ، خلوت مبارک، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲،

یہ جنوبی ہند کے ایک مشہور بزرگ حضرت سید شاہ اسماعیل قادری کا تذکرہ ہے، مصنف کو تلاش کے باوجود ان کے حالات کم ملے ہیں، البتہ انھوں نے اس میں شاہ صاحب کے شجرۂ نسب، خوارق، تصرفات، عرس و نیاز اور درگاہ و مزار کے متعلق بعض معلومات جمع کر دئے ہیں، اور درگاہ کی متعدد عمارتوں کے عکسی فوٹو بھی دئے ہیں، عرس کی جو تفصیل دی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے بزرگوں کے مزاروں اور عرسوں کی طرح یہاں بھی غیر شرعی رسمیں مروج ہیں، بعض خامیوں کے باوجود یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے،

"ض"

جلد ۱۱۹ ماہ نومبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ عدد ۵

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

عہد نبوت کے شہر یثرب (مدینہ) پر ایک نظر — مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، — ۳۲۵-۳۴۷
یہود اور قرآن مجید — ضیاء الدین اصلاحی — ۳۴۸-۳۶۴
صبح الاعشیٰ — محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے علیگ — ۳۶۵-۳۸۴
استدراک — پروفیسر سید حسن پٹنہ — ۳۸۵-۳۸۶

وفیات

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب — ضیاء الدین اصلاحی — ۳۸۷-۳۹۲
آہ! ڈاکٹر وحید مرزا، — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۳۹۲-۳۹۶
مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۳۹۷-۴۰۰

......٥٥......